

اچھوت
علیم الحق حقی
HIV+

پیش لفظ

لغوی اعتبار سے اچھوت کا مطلب ہے "بے چھوا۔ کورا" محاورتاً اچھوت کا مطلب ہے وہ جسے چھونا جائز نہ ہو یا درست نہ ہو۔

اچھوت کی اصطلاح سب سے پہلے کب استعمال کی گئی اور کس نے استعمال کی؟ اس کا جواب تو شاید کوئی نہ دے سکے لیکن برصغیر میں پہلے پہل یہ لفظ ہندومت کی نچلی ذاتوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ شودر (جنہیں گاندھی نے ہری جن کا نام دے کر مشرف بہ کانگریس کرنے کی کوشش کی تھی) اچھوت کہلائے۔ جن کا چھونا یا ان کے قریب رہنا یا ان کی چھوئی چیز استعمال کرنا اونچی ذاتوں کے لیے حرام تھا۔

زمانہ بھوج پتر کے عہد سے نکل کر کمپیوٹر کے دور میں آ پہنچا۔ اس دور سے اس دور تک دنیا نے کئی ارتقائی مدارج طے کیے۔ بہت سی چیزیں بدل گئیں۔ بہت سی اصطلاحات کے مفہوم تبدیل ہو گئے یا ان میں مزید وسعت آ گئی۔ اچھوت کا مفہوم بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ مختلف ملکوں اور معاشروں میں مختلف چیزیں "اچھوت" بن کر سامنے آئیں۔ لیکن عموماً بیشتر اچھوت چیزیں عالمی نوعیت کی حامل نہ ہوتی تھیں۔ خال خال کوئی ایسی مثال ملتی تھی جو پوری انسانیت کے لیے اچھوت ٹھہرے جیسے جذام یا طاعون کے مریض وغیرہ۔

بیسیویں صدی میں ایڈز "اچھوت پن" کی خوفناک ترین اور عالمگیر علامت بن کر سامنے آئی۔

ایڈز لاعلاج بیماریوں میں سرفہرست ہے۔ ایڈز کا شکار اپنے عبرت ناک انجام کے سامنے بے بس ہے۔ موت سے پہلے کی تکالیف اس کا جینا دوبھر کر دیتی ہیں۔ یہ اور ان جیسے کئی حقائق مل کر ایڈز کا ایسا ہیبت ناک نقشہ کھینچتے ہیں کہ ہر باشعور انسان اس کے تصور سے ہی لرز اٹھتا ہے۔

کینسر، ٹی بی، ہیضہ اور دوسری خطرناک بیماریوں کی طرح ایڈز بھی ایک بیماری ہی ہے لیکن اپنی منفرد نوعیت کی وجہ سے اس نے بہت سی غلط فہمیوں کو بھی جنم دیا ہے۔ ایڈز کا مریض اپنی بیماری کے ہاتھوں تکلیف میں تو مبتلا ہوتا ہی ہے لیکن بیماری سے زیادہ

اس کے آس پاس کے لوگ اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔

لوگوں کا بھی کچھ زیادہ قصور نہیں۔ دراصل ایڈز کا سب سے عمومی سبب نہایت شرمناک اور باعث ذلت ہے۔ ایک ایڈز کے مریض کو دیکھتے ہی ذہن میں سب سے پہلا خیال یہی آتا ہے کہ یہ ضرور اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے اس بیماری میں مبتلا ہوا ہے۔ حالانکہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایڈز کئی دوسرے ذرائع سے بھی حملہ آور ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ایسے معاملات میں انسانی سوچ ہمیشہ تصویر کا تاریک رخ ہی پہلے دیکھتی ہے۔

مریض کو شک و شبہ کی نظروں سے گھورا جاتا ہے۔ اس پر جا و بے جا الزام لگائے جاتے ہیں۔ اس کے نام سے طرح طرح کے قصے مشہور کیے جاتے ہیں۔ طنز و تشنیع اور بدنامی کے مسلسل تیروں سے مریض بوکھلا اٹھتا ہے۔ جب وہ اپنے گھر، اپنے ماحول اور اپنے جیسے گنہگار انسانوں کے ماحول میں وہ اچھوت بنا دیا جاتا ہے تو اس کی نفسیاتی کیفیت بری طرح بگڑ جاتی ہے اور ایسی حالت میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ علیم الحق حقی کے تازہ ناول "اچھوت" کا موضوع یہی ہے۔

علیم الحق حقی نے "اچھوت" میں ایڈز کے شکار مریض کی نفسیات، ایڈز کے عوامل اور اس بلا کی روک تھام کے سلسلے میں حکومت کی حقیقی ذمہ داریوں کا بڑی تفصیل اور باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ ایڈز کے پھیلنے کی بڑی وجہ یہی ماحول ہے جو ہم ایڈز کے مریضوں کے لیے پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اپنے مرض کو چھپانے پر مجبور ہوتے ہیں اور انجام کار کسی دوسرے بے گناہ کو دانستہ یا نادانستہ طور پر اس میں مبتلا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

حکومتی ذمہ داریاں اس سلسلے میں کچھ بھی رہی ہوں، یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اس انتہائی نازک اور حساس مسئلے کے حل کے لیے کوئی جامع اور موثر پروگرام ابھی تک ترتیب نہیں دیا گیا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

انسانی ذہن کی بھول بھلیوں اور رویوں کی خارزار راہوں کو بڑی نفاست سے طے کرتی یہ کہانی یقیناً آپ کو آخر تک اپنے سحر میں گرفتار رکھے گی۔

آفتاب ہاشمی

بشیر کو وہ گاہک اچھا نہیں لگا تھا!

وہ طارق روڈ کی ایک اعلیٰ درجے کی باربر شاپ تھی..........ائرکنڈیشنڈ۔ وہاں صرف متمول لوگ ہی آتے تھے۔ کیونکہ وہاں خدمات کی اجرت بہت زیادہ وصول کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود گاہک کاریگر کو بھاری ٹپ بھی دیتے تھے۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ کوئی کنگلا وہاں گھس آئے اور بال بنوانے یا شیو کرانے کے بعد اجرت پر ناک بھوں چڑھائے اور ٹپ دیئے بغیر چلتا بنے۔ زیادہ تر تو لگے بندھے گاہک ہی ہوتے تھے۔ مگر بشیر جانتا تھا کہ ہر آنے والے کو معزز سمجھنا اور اسے سر کہہ کر بات کرنا ضروری ہے۔ وہ بہت اچھا کاریگر تھا۔ اسی لیے وہاں کام کر رہا تھا۔ ٹپ بہت اچھی ملتی تھی۔ آمدنی کافی تھی لیکن کسی گاہک کی شکایت پر اچھے سے اچھے کاریگر کو نکالا جا سکتا تھا۔ اچھے کاریگروں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن اچھے گاہک بہت اہم تھے۔

یہ گاہک عام سی شلوار قمیض پہنے تھا۔ اس کی گھنی داڑھی بہت بے ترتیب تھی، دکان میں داخل ہوتے وقت وہ نروس تھا۔ لگتا تھا خود اعتمادی اسے چھو کر نہیں گزری ہے۔ وہ آ کر کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ بدقسمتی سے اس وقت صرف بشیر ہی فارغ تھا۔ چنانچہ اسے مؤدبانہ انداز میں کہنا پڑا "اس کرسی پر تشریف لے آئیں سر۔"

گاہک اس کی بتائی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے بال چھوٹے کرانے ہیں۔ بہت چھوٹے۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"بہت بہتر سر۔"

بشیر نے صاف ستھری چادر لپیٹی اور اس کے بال تراشنے میں مصروف ہوگیا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ائرکنڈیشنڈ ماحول میں بھی اس شخص کو پسینہ کیوں آرہا ہے۔ یقینی طور پر وہ بہت نروس تھا۔ شاید اس لیے کہ پہلی بار ایسی کسی دکان میں بال ترشوا رہا تھا۔

بشیر اپنا کام کرتا رہا۔ وہ اتنا ماہر تھا کہ بے دھیانی میں بھی کبھی اس کا ہاتھ نہیں بہکتا تھا۔ مگر جو کچھ ہوا' وہ جانتا تھا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ قینچی سے کانوں کے اوپر کے بال ٹھیک کر رہا تھا۔ اس کام میں قینچی کی نوکیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اچانک گاہک نے یوں سر جھٹکا' جیسے جسم کے کسی حساس حصے پر مکھی بیٹھ گئی ہو۔ حالانکہ دکان میں مکھی کا کوئی کام نہیں تھا۔ قینچی اس وقت گدی کی طرف نیچے کا سفر کر رہی تھی۔ اس کی نوکیں نرم گوشت میں دھنس گئیں۔ سرخ خون کی ایک چھوٹی سی بوند ابھر آئی اور بتدریج بڑی ہونے لگی۔ بشیر کا چہرہ فق ہوگیا۔ اسے ڈر تھا کہ گاہک اس پر برسے گا۔ پھر دکان کا مالک آئے گا اور..........

وہ سحرزدہ سا خون کی اس بڑی ہوتی بوند کو دیکھتا رہا۔ اس کے لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ اس کے ہاتھوں..........

"کوئی بات نہیں۔ غلطی میری ہی تھی۔"

بشیر نے چونک کر گاہک کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں کی کیفیت مختلف تھی۔ وہ بے حد سرد لگ رہی تھیں "سوری سر!" بشیر نے کہا۔

"میں نے کہا نا' غلطی میری تھی۔ کبھی کبھی میں اپنی جھرجھری پر قابو نہیں رکھ پاتا ہوں۔ تم ایسا کرو' یہاں آفٹرشیو لوشن لگا دو۔"

"ضرور سر!" یہ کہہ کر بشیر نے آفٹرشیو لوشن کی شیشی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں ہاتھوں کے لمس سے حتی الامکان بچتا ہوں۔" گاہک نے اسے پھر چونکا دیا۔

"لوشن ہاتھ سے نہیں لگانا۔ کوئی اسپرے لوشن نہیں ہے تمہارے پاس؟"

اس لمحے بشیر اس گاہک کے بارے میں رائے بدلنے پر مجبور ہوگیا۔ اب گاہک کے لہجے میں خوداعتمادی بلکہ سختی تھی اور لگتا تھا کہ وہ ایسی ہی دکانوں سے بال ترشواتا رہا ہے۔

"کیوں نہیں سر ابھی لیجیے۔" بشیر نے کہا۔ اب اس کا لہجہ اعتماد سے محروم تھا اور وہ نروس ہوگیا تھا۔

اس نے دوسری شیشی اٹھا کر اس کے زخم پر لوشن لگایا اور دوبارہ سوری کہا۔ گاہک اس بار خاموش رہا۔ بشیر اب جلد از جلد اسے نمٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ انداز میں عجلت لائے بغیر ہاتھ چلاتا رہا۔ مگر آخری مرحلے میں پھر گڑبڑ ہوگئی۔ اس بار وہ گدی کے نیچے کے بال استرے سے صاف کر رہا تھا کہ گاہک کا جھرجھری کا مرض پھر عود کر آیا۔ اس بار کٹ خاصا گہرا تھا۔ لیکن گاہک کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے پتا بھی نہیں چلا ہے۔ بشیر نے پف کی مدد سے پاؤڈر لگایا اور برش سے پاؤڈر اور بال جھاڑ دیئے۔ پف پر خون کا داغ لگ گیا تھا۔

"خط بنوائیں گے سر؟" بشیر نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن داڑھی چھوٹی نہ کرنا۔"

"بہت بہتر جناب۔"

"اور ہاں' یہ نصف بلیڈ والا استرا استعمال نہ کرنا۔" گاہک نے کہا "مجھے وہی پرانا پھل والا استرا پسند ہے۔"

بشیر کو حیرت نہیں ہوئی۔ اکثر ایسے گاہک آتے تھے' جو پھل والے استرے سے شیو کراتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ نیا استرا جس میں ہر بار نیا نصف بلیڈ لگادیا جاتا تھا' اسے بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اسے بہت ہلکا لگتا تھا۔

"جی بہتر سر۔"

"اور اس بار میرے گلے پر مشق ستم نہ کر بیٹھنا۔" گاہک نے شگفتگی سے کہا لیکن اس کے لہجے میں سنگینی تھی۔

اس بار بشیر سچ مچ نروس ہوگیا۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ کام کے دوران کبھی اس

کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہوئی ہو، مگر اس وقت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بار گھاؤ اس کی ہی غلطی سے لگا۔ اس کا ہی ہاتھ بہکا تھا۔

”کیا بات ہے بھائی۔ نروس کیوں ہو؟“ گاہک نے سخت لہجے میں کہا۔

”سوری سر۔ یقین کریں، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔“ بشیر گھگیانے لگا۔

”چلو خیر............ لیکن اس بار وہ لوشن نہ لگانا۔ اس کی خوشبو مجھے اچھی نہیں لگی ہے۔ اور ہاں............ لوشن ہاتھ سے نہ لگانا۔“

بشیر اسے ہر قیمت پر خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ الماری میں سے ایک اور لوشن نکال لایا۔

یہ کام مکمل ہوا تو گاہک نے کہا ”اب تم میرے بال دھو ڈالو اور پھر کلر لگا دینا............ لائٹ براؤن۔“

بشیر کٹنگ کے دوران دیکھ چکا تھا کہ گاہک کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہیں لیکن اسے رنگ کے انتخاب پر حیرت ہوئی کیونکہ اس کے بالوں کی قدرتی رنگت سیاہ تھی۔ تاہم اس نے اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

بشیر کو ٹپ کی مطلق امید نہ تھی۔ اس نے شیمپو سے بال دھوئے۔ پھر کلر کیا۔ اس کے بعد گاہک کو ایک میگزین تھما کر بال خشک ہونے کے وقفے میں اس نے ایک اور گاہک کو نمٹایا۔ پھر آخری بار بال دھو دیئے۔

اس گاہک پر اس نے ڈیڑھ گھنٹا صرف کیا تھا اور بے سود۔ گاہک کاؤنٹر پر ادائیگی کرکے اس کی طرف آیا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ گاہک نے اس کے ہاتھ میں دس روپے کے چند نوٹ تھمائے تو وہ حیران رہ گیا۔

”میں اچھا کام کرنے والوں کی قدر کرتا ہوں۔“ گاہک نے مسکراتے ہوئے کہا ”اور تم اچھے کاریگر ہو۔“

بشیر نے اس کے باہر نکلتے ہی اطمینان کی سانس لی اور نوٹوں کو دیکھا۔ وہ چالیس

روپے تھے............ یعنی پچیس فیصد ٹپ!

☆============☆============☆

باربر شاپ سے نکلنے کے بعد اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہیں رہی تھی!

اسے اپنا نام، اپنی شخصیت بدلنے میں ڈیڑھ ماہ لگا تھا۔ ڈیڑھ ماہ پہلے تک وہ کروڑ پتی صنعت کار عاصم قریشی تھا۔ مگر اب وہ مرشد حسین تھا، جسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا چہرہ اب کلین شیو نہیں تھا بلکہ مونچھوں اور گھنی داڑھی کے حصار میں آگیا تھا۔ پیچھے جانے والے بالوں میں اب مانگ نکلی ہوئی تھی اور وہ انہیں دونوں جانب کنگھا کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں پیشانی پہلے جیسی کشادہ نہیں لگتی تھی۔ بالوں کی رنگت بھی اس نے تبدیل کرلی تھی۔ بال وہ پہلے بھی رنگواتا تھا اس لیے کہ صرف بیس سال کی عمر میں اس کا آدھا سر سفید ہو چکا تھا۔ مگر پہلے وہ ان پر سیاہ رنگ کراتا تھا جو اس کے بالوں کا قدرتی رنگ تھا۔ اب اس نے بالوں کو لائٹ براؤن رنگت دے دی تھی۔ اس کی وجاہت اور خوب روئی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ شاید وہ پہلے سے زیادہ وجیہہ اور خوب رو لگ رہا تھا۔ اس کی عمر اڑتیس سال تھی۔ دیکھنے میں وہ تیس بتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ مگر پچھلے دو ماہ میں اس کے چہرے پر لکیروں نے جالے بن دیئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ اس پر گزری ہی کچھ ایسی تھی۔

اسے گھر سے نکلے دو ماہ ہو چکے تھے۔ فوزیہ اور بالخصوص بچے اسے رہ رہ کر یاد آتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ان کے لیے مرچکا ہے۔ ان بدنصیبوں کی بہتری اسی میں تھی کہ وہ باپ کے زندہ ہوتے یتیم ہو جائیں۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی معاشرے کی نظروں میں مجرم تھا۔ اور یہ اسے گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے انگشت نمائی کا باعث بنے۔ اس لیے وہ چپکے سے ان کی دنیا سے نکل آیا تھا۔

اور اب اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ اس کا وجود انتقام کی آگ میں پھنک رہا تھا۔

☆============☆============☆

روزنامہ سویرا کا رپورٹر وحید نجمی پاک لیب میں ڈاکٹر نجیب کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ نجیب اور وہ پرانے دوست تھے۔ انٹر تک دونوں ساتھ ہی پڑھے تھے۔ پھر ان کی راہیں جدا ہوگئی تھیں لیکن ان کا ایک دوسرے سے رابطہ نہیں ٹوٹا تھا۔ ان میں سب سے بڑی قدر مشترک درد مندی اور انسان دوستی تھی۔ دونوں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق کرتے تھے۔ دونوں کی اپنے اپنے میدان میں ایک ساکھ تھی۔

"کچھ پریشان نظر آرہے ہو؟" نجمی نے نجیب سے پوچھا۔

"ہاں پریشان تو ہوں۔"

نجمی نے محسوس کیا کہ نجیب کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا "اور سناؤ میرے مشورے پر عمل درآمد کے بعد سے اب تک کوئی پروگریس بھی ہوئی ہے یا نہیں؟"

"اسی سلسلے میں تو پریشان ہوں۔" نجیب نے گہری سانس لے کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ایک کیس سامنے آیا تھا۔ ایک ایسا شخص جو مستقل ہماری خدمات حاصل کرتا ہے۔" نجیب نے کہا "وہ باقاعدگی سے کولسٹرول اور شوگر چیک کراتا ہے۔"

نجمی سنبھل کر بیٹھ گیا "تو پھر؟"

"وہ رپورٹ لینے آیا تو میں نے اسے بلوالیا۔ میں نے بڑی نرمی اور ہمدردی سے اسے سمجھایا۔ وہ حیرت انگیز طور پر پُرسکون رہا۔ بس اس نے ایک بار اتنا کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر۔ میں نے اسے ایک ہفتے بعد بلایا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" نجمی نے پوچھا۔

"دو ماہ سے زیادہ ہوگئے۔"

"اور تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا۔"

"تم بھول رہے ہو بھائی کہ تم ایک مصروف صحافی ہو۔" نجیب نے تھکے تھکے لہجے

میں کہا "اس عرصے میں تم وزیراعظم کے ساتھ بیرون ملک سفر کرتے رہے ہو۔"

"اوہ سوری، مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ خیر، پھر کیا ہوا؟"

"وہ ایک ہفتے بعد آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوا۔ اس کے انداز میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ اس نے جاتے وقت کہا تھا.......... مجھے یقین ہے ڈاکٹر کہ ایسی کوئی بات میرے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے کسی سے۔ ایک ہفتے بعد وہ نہیں آیا تو میں نے اس کے گھر فون کیا۔ اس کی بیوی سے پتا چلا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں امریکہ گیا ہے۔ ایک ماہ بعد واپس آئے گا۔ میں اس کیس کو پہلے ہی محکمہ صحت کے حوالے کر چکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسے ان کے پاس بھیج دوں۔"

"تو پھر؟"

"اب اس کا سراغ ہی نہیں مل رہا ہے۔ میں نے ایک ماہ انتظار کیا۔ پھر دوبارہ فون کیا اس کے گھر۔ اس بار اس کی بیوی پریشان تھی۔ وہ شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا چکی تھی۔ اس بات کو تقریباً ایک ماہ ہو چکا ہے۔ پولیس بھی اس کی تلاش میں ناکام رہی ہے۔"

"پولیس مجرموں کو تلاش نہیں کرپاتی، جن کی تعداد بہرحال شرفا کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ وہ کسی شریف آدمی کو کیا تلاش کرے گی۔" نجمی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بہرحال محکمہ صحت والوں کا نزلہ مجھ پر گر رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کو خود ہینڈل کرنے کی بجائے صرف انہیں مطلع کر دینا چاہیے تھا۔ وہ خود دیکھ لیتے، اس معاملے کو۔"

"کیا دیکھ لیتے، ہوتا پھر بھی یہی۔"

"اس ملک میں تو پتلی گردن ہی ڈھونڈی جاتی ہے نا۔ مجھے سختی سے ہدایت کی گئی ہے کہ آئندہ اس معاملے میں، میں صرف مخبر کا رول ادا کروں۔"

"تو یہ ہے تمہاری پریشانی کا سبب۔" نجمی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یہ ایسا ہے جیسے، کوئی پاگل کتا بھرے شہر میں آزاد پھر رہا ہو۔ اب وہ جسے بھی کاٹے گا اس کی موت اور اس کے گھرانے کی تباہی کا ذمے دار میں ہوں گا۔"

"بھائی وہ کتا نہیں' انسان ہے۔" نجمی نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" نجیب نے شرمندگی سے کہا "یہ میں نے محکمہ صحت والوں کے الفاظ دہرائے تھے۔"

ویسے تمہارا اندازہ کیا ہے۔ تمہارا مریض کیا سوچ کر بھاگا ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" نجیب نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا "میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت اس نے کہا کہ یہ ناممکن ہے' اس کے لہجے میں وہ اعتماد تھا' جو ایک صاف ستھری زندگی گزارنے والے ہی کا ہو سکتا ہے۔ اس کے لہجے میں' اعتماد ہی نہیں چیلنج بھی تھا۔ بعد میں اس نے میری بات پر غور کیا ہو گا تو اس پر نہ جانے کیا گزری ہو گی۔ وہ بہرحال بہت بڑا دھاکا تھا اس کے لیے۔ لیکن ہم کسی کے ردعمل کا درست اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بہرکیف مجھے اس وقت یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ غائب ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اس کا نام پتا بتاؤ۔" نجمی نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ کچھ پیشہ ورانہ اخلاقی ضابطے بھی ہوتے ہیں۔ میں کسی مریض کو ایکسپوز نہیں کر سکتا۔ اس کی بیماری کا راز........."

"قومی ذمے داری ہر اخلاقی ضابطے سے بڑی ہوتی ہے۔ کیا تمہیں صورت حال کی سنگینی کا اندازہ نہیں؟"

"اندازہ تو ہے لیکن........."

"تمہیں اندازہ نہیں ہے۔" نجمی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "تصور تو کرو کہ اس کے نتائج کہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسے تلاش کرنا ضروری ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" ڈاکٹر نجیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن میں نہیں چاہتا

کہ اس کا نام اچھالا جائے۔"

"میں صرف اسے تلاش کروں گا۔ یہ میرے لیے محض اسٹوری نہیں ہے۔"

☆===========☆===========☆

کبھی کا عاصم قریشی اور حال کا مرشد حسین بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد سے اب تک وہ ایک بار بھی بھرپور نیند نہیں لے سکا تھا۔ زہریلی سوچوں نے اس کے پورے وجود کو تلخ کر کے رکھ دیا تھا۔

اس دن' اس وقت' اس بھیانک لمحے کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا جس نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ اب اس بات کو دو ماہ سے اوپر ہو چکے تھے۔ وہ اس روز اپنے خون کے ٹیسٹ کی رپورٹ لینے پاک لیب گیا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر رسید دی تو کلرک نے کہا "سر' آپ کی رپورٹ ڈاکٹر نجیب کے پاس ہے۔ آپ ان سے مل لیں۔"

اس کا دل دھڑک اٹھا "خیریت تو ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے سر۔ وہ آپ کو کوئی مشورہ دینا چاہتے ہیں۔" کلرک نے بے حد خلوص سے کہا۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ وہ برسوں سے باقاعدگی سے خون ٹیسٹ کرا رہا تھا۔ محض احتیاطاً تاکہ شوگر اور کولسٹرول نہ بڑھنے پائے۔ وہ جانتا تھا کہ صحت کی بہت اہمیت ہے۔ صحت نہ ہو تو دولت بھی بے کار ہے۔ مگر اب اس کا دل اندیشوں کے بوجھ سے لرز رہا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ضرور کوئی گڑبڑ تھی......... شوگر یا کولسٹرول۔ اور اس میں اضافہ اتنا ہو گا کہ ڈاکٹر نجیب نے اسے مشورہ دینا ضروری سمجھا۔

اس نے دھڑکتے دل سے ڈاکٹر نجیب کے دفتر کے دروازے پر دستک دی "پلیز کم ان" اندر سے ڈاکٹر کی آواز آئی۔

وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف رکھیے قریشی صاحب۔"

وہ بیٹھ گیا اور مستفسرانہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھتا رہا۔ ان چند لمحوں کی خاموشی بہت سنگین تھی۔ ڈاکٹر کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی اور عاصم.......... وہ اس سے کچھ پوچھتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ نہ جانے کیا سامنے آئے۔

آخر کار ڈاکٹر کی خاموشی ٹوٹی "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو زحمت دی لیکن یہ ضروری تھا۔"

عاصم خاموش رہا۔ وہ خود کو بری خبر کے لیے تیار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر کی شاید سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بری خبر کیسے سنائے۔ شاید اسی لیے اس نے بلا تمہید دھماکا کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں سختی اور لہجے میں درشتی تھی "قریشی صاحب، آئی ایم سوری لیکن آپ کے خون میں ایچ آئی وی پازیٹو ملا ہے۔"

چند لمحے تو عاصم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بلکہ اس نے سکون کی سانس بھی لی۔ وہ تو ڈر رہا تھا کہ یہ شوگر کا یا دل کا کوئی سنگین معاملہ ہوگا لیکن پُرسکون ہوتے ہی بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اسے زبردست شاک لگا۔ چند لمحے تو اس کی آواز ہی نہیں نکلی۔ پھر اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "آپ کا مطلب ہے ایڈز.........."

ڈاکٹر نجیب نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی "آئی ایم رئیلی سوری قریشی صاحب، لیکن یہ حقیقت ہے۔"

عاصم کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ لیکن کسی نامعلوم حس نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے شدید ردعمل ظاہر کرنے سے بچنا ہوگا اور وہ حس بے حد قوی تھی۔ ذہن میں طوفان برپا ہونے کے باوجود وہ سوچ سکتا تھا کہ اسے تنہائی میں سکون سے اس پر غور کرنا.......... سوچنا ہوگا۔ قبل از وقت ردعمل تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ چہرے کو بے تاثر رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا رہا۔

اس نے عجیب سی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ڈاکٹر نظریں جھکائے بیٹھا تھا جیسے خود کو چور محسوس کر رہا ہو۔ اس حقیقت نے عاصم کو اور پُراعتماد بنا دیا۔ اسے یہاں محض چند

منٹ ایک رول پلے کرنا تھا اور وہ بھی نظریں جھکائے ہوئے مدافعت پر مائل ڈاکٹر کے سامنے۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں تھا۔

"ڈاکٹر صاحب۔" اس نے پکارا۔

ڈاکٹر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو اس نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر.........." پھر وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے اوور ری ایکٹ بھی نہیں کرنا ہے اور اپنی صفائی بھی پیش نہیں کرنی ہے اس لیے کہ ڈاکٹر کیا، دنیا کا کوئی شخص بھی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ چنانچہ یہ بے سود ہے۔ یہ دکھ وہ صلیب ہے جو اسے تنہا اپنے کندھوں پر اٹھانی ہے۔ اس نے بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں، پُریقین لہجے میں دہرایا "یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں ہمدردی اور تفہیم کی چمک ابھری جیسے وہ اس پانچ لفظی بلیغ جملے کے تمام معانی اور مفاہیم کو سمجھ چکا ہو "یہ ہر اعتبار سے ممکن ہے قریشی صاحب۔" اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا "اس کی بے شمار صورتیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس میں آدمی کا قصور ہو۔"

عاصم بھی جانتا تھا کہ ڈاکٹر درست کہہ رہا ہے "تو پھر؟" اس نے پوچھا۔

"آپ اگلے ہفتے میرے پاس آئیں۔ اس دوران میں اور اچھی طرح چیک کرلوں گا۔" ڈاکٹر جانتا تھا کہ یہ دوبارہ چیک کرنا محض طفل تسلی ہے۔

"میں ضرور آؤں گا ڈاکٹر صاحب۔" عاصم نے اٹھتے ہوئے کہا "اس یقین کے ساتھ کہ آپ مجھے خوش خبری سنائیں گے کہ یہ محض ایک تکنیکی غلطی کا نتیجہ تھا۔"

ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر وہ کمرے سے نکل آیا۔ باہر آکر اسے احساس ہوا کہ اس نے خون کی رپورٹ تو لی ہی نہیں۔ پھر اس نے کندھے جھٹک دیئے۔ اب کولیسٹرول اور شوگر کی کیا اہمیت رہ گئی تھی!

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ تین بجنے والے تھے۔

آفس جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھانے سے پہلے موبائل فون پر اپنی سیکریٹری سے رابطہ کیا "رعنا.........میں آج دفتر نہیں آسکوں گا۔ کوئی ضروری ملاقات یا مصروفیت تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔ رعنا نے نفی میں جواب دیا تو اس نے رابطہ منقطع کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

سوال یہ تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اسے تنہائی کی ضرورت تھی' جہاں وہ سکون سے بیٹھ کر سوچ سکے۔ آخرکار اس نے گاڑی کا رخ کلفٹن کی طرف موڑ دیا۔ اولڈ کلفٹن تو عام حالات میں بھی سنسان رہتا تھا اور اس وقت تو شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی پارک کرکے وہ ساحل کی طرف چل دیا۔ دھوپ بہت ناگوار تھی لیکن اس وقت وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا۔

وہ ساحل کی نرم ریت پر ٹہلتا رہا۔ اپنی سوچوں اور اپنے ذہن کو مرتکز کرنا کارے دارد تھا۔ خیالات مختلف جہتوں میں دوڑ رہے تھے لیکن اسے ایک فیصلہ کرنا تھا۔ لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ اس کے لیے ذہن کو یکسو کرنا ضروری تھا۔

فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ اپنے جیتے جی اپنی بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرنا کوئی مذاق نہیں تھا لیکن اس کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جس گناہ گار معاشرے میں جی رہا تھا اس سے خوب واقف تھا۔ یہاں برسوں سے یہ رسم چلی تھی کہ اپنا قد بڑھانے کی زحمت کوئی نہیں کرتا تھا۔ گرنے والوں کو لاشوں کی طرح ایک دوسرے پر رکھ کر ان پر چڑھ کر خود کو اونچا کیا جاتا۔ کوئی خود نہ گرتا تو لوگ تاک میں لگے رہتے کہ اڑنگا لگا دیں یا دھکا دے دیں۔ کسی کا گناہ سامنے آجاتا تو گناہ گاروں کی جیسے عید ہو جاتی۔ سب اپنے اپنے تمام گناہوں کی سزا بھی اسے دینے کی کوشش کرتے۔

اور اب اس دور میں خدا کے قہر کی وجہ سے گناہ گاروں کی نقاب کشائی عام ہوگئی تھی۔ گناہ گاروں کی نفسیات بھی عجیب ہوتی ہے۔ عام قسم کے گناہ گار حد درجہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہ صاحب اختیار ہوتے ہیں کچھ اس لیے کہ ان

کے پاس دولت کی طاقت ہوتی ہے اور کچھ اس لیے کہ انہیں ابھی بہت عرصے زندہ رہنے کا یقین ہوتا ہے۔ وہ چڑھتے سورج جیسے گناہ کی بھی تردید کرتے ہیں۔ بلکہ الزام لگانے والوں پر بھی جوابی حملے شروع کر دیتے ہیں۔ جرم کی صحت قبول کرنا تو دور کی بات ہے' وہ اپنے خداداد اختیار اور اقتدار سے دست بردار ہونا بھی قبول نہیں کرتے' جو ان پر اخلاقاً واجب ہوتا ہے۔ مگر مسئلہ تو یہی ہے کہ یہ معاشرہ اخلاقی انحطاط کی آخری حدوں کو پہنچ چکا ہے۔

مگر وہ گناہ گار جسے یہ علم ہو جائے کہ موت اس پر حملہ آور ہو چکی ہے اور اب وہ دنوں' ہفتوں مہینوں یا چند برسوں کا مہمان ہے' وہ تو جیتے جی مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ ساری ڈھٹائی' تمام تاویلیں اور جوابی الزامات' دوسروں کی عیوب کشائی' سب کچھ زندگی کے یقین سے وابستہ ہوتا ہے۔ حالانکہ زندگی کا یقین تو صحت مند آدمی کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ مگر یہاں بات شاید موت کے یقین کی ہے۔ یقینی موت سامنے ہو تو ہر چیز اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔ آدمی جان لیتا ہے کہ عمر بھر جس کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا رہا' جس سے نظریں چراتا رہا' اب اسے بہرحال اس کا سامنا کرنا ہے۔ تب اُس کے پاس صرف پشیمانی اور خوف رہ جاتا ہے۔ اپنے خالق' اپنے رب کا سامنا کرنے کے تصور سے اس پر لرزہ طاری رہتا ہے۔

اب یہاں معاشرے کے مزاج کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ اکڑ کر' آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تردید جرم پیش کرتا' تاویلات گھڑتا اور جوابی حملے کرتا ہوا طاقت ور گناہ گار محترم ہی رہتا ہے اور وہ جو گناہ کی پاداش میں جیتے جی مٹی کا ڈھیر بن گیا ہو' اسے پورا معاشرہ ملامت اور طعنوں کی پھونکوں سے بکھیر دینے پر تل جاتا ہے۔ اسے اچھوت بنا کر رکھ دیا جاتا ہے جیسے وہ قبل از مسیح کا کوڑھی ہو۔

اور پھر کوئی ایسا شخص جو بے گناہ ہو لیکن سزا اسے گناہ گاروں کی مل رہی ہو۔ ایسے شخص کا کیا حشر ہوگا۔ وہ تو دہرے کرب میں زندگی گزارے گا۔ ایک تو ناکردہ گناہ کی سزا کا

کرب اور دوسرے یہ کرب کہ کوئی اس کی بے گناہی تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ اچھوت بن کر رہے گا' زمانہ قبل از مسیح کے کوڑھی کی طرح۔ اور یہاں تو اس کے ساتھ اس کی بے گناہ بیوی اور معصوم بچے بھی اچھوت بن کر رہ جائیں گے.........

عاصم نے جھرجھری لی اور اس کے خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ اس وقت اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ موجوں کا شور سن کر اس نے چونک کر دیکھا تب اسے یاد آیا کہ وہ ساحل کی ریت پر چلتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ رک گیا تھا۔ یہ آخری خیال بے حد روح فرسا تھا۔ فوزیہ' پانچ سالہ سلیم اور تین سالہ ملیحہ......... ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن بے قصور تو وہ خود بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کے اور اس کے خدا کے سوا کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا۔ اس بار خدا کا خیال آتے ہی اس کا وجود غصے سے کانپنے لگا "کیوں دی ہے تو نے مجھے یہ سزا؟" وہ آسمان کی طرف منہ کر کے چلایا "جبکہ میں اس سزا کا مستحق نہیں تھا۔ یہ کیسا انصاف ہے؟"

مگر اوپر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ بکتا جھکتا رہا۔ آخر تھک ہار کر خاموش ہو گیا.........نڈھال!

بھڑاس کسی حد تک نکل چکی تھی۔ اب وہ نسبتاً پُرسکون انداز میں سوچ رہا تھا۔ بیوی بچوں کی خاطر اسے جیتے جی مرجانا تھا۔ اس میں ان کی بھی بہتری تھی اور خود اس کی بھی۔ وہ عزت سے مرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ حق خدا نے اس سے چھین لیا تھا۔ پھر بھی اسے کوشش کرنا تھی۔ اور کوشش میں کامیابی کا امکان بھی تھا۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ بچوں کے مستقبل کو وہ بہ آسانی محفوظ کر سکتا تھا۔ اس طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے مشن کی طرف توجہ دینا تھی۔ اب جتنی بھی زندگی رہ گئی تھی اس میں اسے یہی ایک کام کرنا تھا جس کا مقصد تھا انتقام۔

"دنیا نے جس بھی شکل میں اور جس بھی روپ میں۔ جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں" وہ ساحر کے شعر کو تصرف کے ساتھ گنگناتا رہا۔ وہ ساحل پر ٹہلتے ہوئے اپنے

منصوبے کی نوک پلک درست کرتا رہا۔ شام ہوئی تو وہ گھر میں آخری رات گزارنے کے لیے چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے فوزیہ کو بتایا کہ وہ بزنس کے سلسلے میں اگلے روز امریکہ جا رہا ہے۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ فوزیہ جانتی تھی کہ جب سے اس کے سر میں امریکہ میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا سودا سمایا ہے' وہ اچانک ہی امریکہ کا رخ کرتا ہے۔

اس رات وہ ایک پل بھی نہیں سویا۔ سلیم اور ملیحہ کو خود سے لپٹائے ہوئے وہ رات بھر جاگتا رہا۔ وہ اپنے جگر گوشوں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والا تھا۔ لیکن وہ شدید خواہش کے باوجود انہیں پیار کرنے کی جرات نہ کرسکا۔ اپنے بچوں کے معاملے میں آدمی کتنا محتاط ہو جاتا ہے۔

وہ عاصم قریشی کی آخری رات تھی۔

اب اسے اپنے مشن کا آغاز کیے تقریباً بیس دن ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی اب تک کی کارگزاری کے بارے میں سوچا اور اس کے نتائج کا تصور کیا۔ اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ ایک لمحے کو مچلی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ چونک کر اٹھ بیٹھا "یہ کیا کر رہا ہوں میں۔ یہ تو ٹھیک نہیں" وہ لرزیدہ آواز میں بڑبڑایا۔

اور جیسے جیسے وہ سوچتا گیا یہ خیال زور پکڑتا گیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ واقعی' اس نے اس انداز میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔ سوچتا بھی کیسے؟ اس کا ذہن' اس کی سوچیں......... سب کچھ تو مسخ ہو چکا تھا۔ جس شخص پر اتنی بڑی قیامت گزری ہو وہ بھلا سوچنے کے قابل رہ سکتا ہے؟ اس نے تو خدا سے بھی بغاوت کر دی تھی۔ مگر اس وقت اس کی یہ رہنمائی خدا نے ہی کی تھی۔

اب وہ سوچنا چاہتا تھا لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ ایسے نہیں' سکون سے۔ اس نے خود کو تلقین کی۔ یہ نیند سے محروم دماغ ٹھیک طرح سے نہیں سوچ سکتا۔ تمہیں ایک

اچھی نیند لے کر خود کو تازہ دم کرنا ہوگا ورنہ تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔ بے بسی سے مرنے کے سوا۔

اس نے دراز کھول کر ویلیم کی پانچ ملی گرام کی دو ٹکیاں نکالیں' اٹھ کر کولر سے پانی لیا اور دونوں ٹکیاں حلق سے اتار لیں۔ گھر سے نکلنے کے بعد سے اب تک نیند کی دوا اس کے لیے بے اثر ثابت ہوئی تھی لیکن اس وقت نیند کی ضرورت کا جواز بہت مضبوط تھا۔ وہ خود سے اپیلیں کرتا رہا۔ آخر کار اسے نیند آگئی۔

☆============☆============☆

وحید نجمی سب سے پہلے کلفٹن تھانے کے ایس ایچ او انسپکٹر شہاب سے ملا۔ وہاں سے جو معلومات حاصل ہوئیں' وہ سنسنی خیز تھیں۔ یہ بات طے تھی کہ عاصم قریشی سرے سے امریکہ نہیں گیا تھا۔

"ہمارے ہاں رپورٹ ایک ماہ بعد درج کرائی گئی تھی۔" انسپکٹر شہاب نے بتایا "اس کی بیوی مطمئن تھی کہ وہ امریکہ گیا ہوا ہے۔ جب وہ واپس نہیں آیا تو اسے تشویش ہوئی۔ تب وہ ہمارے پاس آئی۔ ہم نے سب سے پہلے ائرپورٹ کا ریکارڈ چیک کیا لیکن پاکستان سے باہر جانے والوں میں اس کا نام نہیں تھا۔"

"پھر؟" نجمی نے پوچھا۔

"ہم نے معمول کے مطابق کاروائی شروع کی۔ اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کی پھر اس کی سیکرٹری سے۔ سیکرٹری نے بتایا کہ عاصم قریشی نے سختی سے اسے ہدایت کی تھی کہ اس کے بارے میں کوئی بھی پوچھے تو یہی بتایا جائے کہ وہ امریکہ گیا ہوا ہے۔"

"کوئی وجہ نہیں بتائی تھی اس نے؟"

"سیکرٹری صرف احکامات کی تعمیل کرتی ہے' وجہ نہیں پوچھتی۔" انسپکٹر نے خشک لہجے میں کہا "اور اس ہدایت سے اس کی بیوی بھی مستثنیٰ نہیں تھی۔"

سوال یہ ہے کہ سیکرٹری کو اس راز میں شریک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی۔" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "اسے اپنی ملیں فروخت کرنا تھیں۔ سودا مکمل ہوگیا تو اس نے سیکرٹری کو بتایا کہ اب وہ امریکہ جا رہا ہے۔"

"لیکن امریکہ وہ پھر بھی نہیں گیا؟" نجمی نے کہا۔ ملوں کی فروخت کے تذکرے پر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ "ایک بات بتاؤ' کیا اس نے اپنی تمام ملیں فروخت کر دیں؟"

"ملیں ہی نہیں' اپنے رہائشی بنگلے کو چھوڑ کر تمام اثاثے۔ ان میں زرعی زمین بھی تھی جہاں کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔"

"تو یہ تو لمبا سودا ہوا۔"

"ہاں میری اطلاع کے مطابق ۹۰ کروڑ کی ڈیل تھی۔"

"۹۰ کروڑ!" نجمی نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ "اتنی جلدی اتنی تگڑی پارٹی مل جانا حیرت انگیز بات ہے۔"

"یہ پورا معاملہ ایک ہفتے میں نمٹ گیا تھا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "وجہ یہ ہے کہ پارٹی پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ غیر ملکی پارٹی ہے' غیر ملکی سرمایہ کاروں کا گروپ ہے۔"

"اور یہ سودا-------"

"ہر اعتبار سے قانونی ہے۔ اب قریشی انڈسٹریز کے منتظم اعلیٰ مسٹر ڈیوڈ میلکم ہیں۔ حکومت بھی ان سے ہر ممکن تعاون کر رہی ہے۔ ڈیل کی تصدیق حکومت پاکستان نے کی ہے۔ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو کہ حکومت غیر ملکی سرمایہ کاروں کی کس طرح حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

نجمی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "لیکن انسپکٹر ۹۰ کروڑ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔" اس نے کہا۔ "تم نے یہ معلوم کیا کہ ادائیگی کس طرح سے ہوئی؟"

"کوشش کی تھی میں نے۔ لیکن مسٹر ڈیوڈ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہیں اور میں ان پر زور نہیں ڈال سکتا تھا۔"

نجمی اس کی پوزیشن سمجھتا تھا۔ یہ معاملہ انسپکٹر کے بس کا نہیں تھا۔ "تم نے یہ

معلوم کیا کہ سودا مکمل ہونے تک عاصم قریشی کہاں مقیم رہا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ ایک ہفتے انٹر کان میں رہا تھا۔"

"اور اس کے بعد؟"

انسپکٹر نے کندھے جھٹک دیئے۔ "اس کے بعد شاید وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔"

"اب یہ بتاؤ کہ اس کیس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

انسپکٹر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا "میرا خیال ہے' وہ کسی منصوبے کے تحت غائب ہوا ہے لیکن یہ ناممکن نہیں کہ وہ خطرات میں گھر گیا ہو۔ وہ بہت دولت مند آدمی ہے اور تم جانتے ہو کہ آج کل شہر کا ماحول کیسا ہے؟ ضروری نہیں کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کر سکے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس وقت وہ زندہ ہو۔"

نجمی نے دل میں کہا---- ہاں' اس کی زندگی کی تو کوئی ضمانت نہیں۔ "تمہارے خیال میں وہ غائب کیوں ہوا ہو گا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ امریکہ سیٹل ہونے کے چکر میں تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے بیوی اور بچوں کے دم چھلوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ ڈرامہ کیا ہو۔ وہ جوان آدمی ہے' دولت کی بھی کمی نہیں۔ امریکہ میں کھل کھیلنا چاہتا ہو گا۔"

"ممکن ہے! میں تمہارا شکر گزار ہوں انسپکٹر۔" نجمی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اتنے سوال تم نے پوچھے۔ اب ایک سوال میں بھی پوچھوں تم سے۔"

نجمی جاتے جاتے پلٹا۔ "ضرور پوچھو۔"

"تم اس کیس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"

"موٹی آسامی بڑی خبر ہوتی ہے۔" نجمی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا "ویسے بھی اس کی گمشدگی کا معمہ بڑی سنسنی خیز کہانی ہے۔ اچھا---- خدا حافظ۔"

☆===========☆===========☆

وہ بارہ گھنٹے سویا تھا!

دو مہینے سے نیند کو ترسا ہوا انسان نیند آ جائے تو ایسے ہی سوتا ہے۔ اٹھا تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ بھوک کا بھی احساس نہیں تھا۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھ کر وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں سے نکلا تو پانی تیار تھا۔ اس نے چائے بنائی۔ ایک پیالی لے کر اس نے باقی چائے تھرموس میں بھری اور تھرموس اور پیالی لے کر بیڈ روم میں چلا آیا۔ چائے کی ایک پیالی سے تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے تھرموس سے دوسری پیالی بھری۔ دوسری پیالی پینے کے بعد وہ خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور آنکھیں موند لیں۔ اب وہ سکون سے سوچ سکتا تھا۔ حقائق اس کے سامنے تھے۔ اسے ان کا تجزیہ کر کے ان سے نتائج اخذ کرنا تھے اور پھر اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

پہلی اور سنگین ترین حقیقت یہ تھی کہ وہ ایڈز کا مریض تھا۔ اس حقیقت پر سوچتے ہوئے اسے اپنا ذہن منتشر ہوتا محسوس ہوا مگر اس بار اس نے جلد ہی اس انتشار پر قابو پا لیا۔ پریشان ہونے سے یہ حقیقت بدل تو نہیں سکتی تھی۔ اس حقیقت کو پوری طرح قبول کر لینے ہی میں عافیت تھی۔

دوسری حقیقت یہ تھی کہ عیاشی اور جنسی بے راہ روی سے اس کا کبھی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا تھا۔

اس حقیقت پر سوچتے ہوئے اسے اپنی غلط سوچ کا احساس ہوا۔ وہ ایڈز کے مریضوں کو قابل نفرت سمجھتا تھا۔ اس کا طرز عمل جیسی کرنی ویسی بھرنی والا ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک وہ بدترین گناہ گار تھے جو کسی ہمدردی کے مستحق نہیں تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ ان میں سے کوئی بے گناہ بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ گناہ گار بھی اس سلوک کے مستحق نہیں ہوتے۔ آخرت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے لیکن جنہیں دنیا میں بھی خدا کی طرف سے سزا مل گئی ہو' انسانوں کو ان کے ساتھ بدسلوکی کا کوئی حق نہیں۔ وہ جن کے مقدر میں اذیت بھری موت لکھ دی گئی' ان کی دل جوئی کرنی چاہیے' کم از کم انہیں اچھوت بنا کر تو نہیں رکھنا چاہیے۔ لواحقین----

بلکہ معاشرے کو ان کی موت آسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس حال میں تو انسان اتنا نازک ہو جاتا ہو گا کہ ملامت کی ایک نگاہ سے اس کا دل چھلنی ہو جائے۔ اسے ایک واقعہ یاد آیا جو ایک انگریزی روزنامے میں شائع ہوا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے علم میں ایڈز کا ایک کیس آیا تھا۔ مریض غریب آدمی تھا۔ خون بیچنا اس کا پیشہ تھا۔ جب اسے علم ہوا کہ وہ اس موذی مرض میں مبتلا ہے تو ڈاکٹر کی تسلی اور دل جوئی بھی اسے سہارا نہ دے سکی۔ وہ انتقام کی باتیں کرنے لگا پھر ایک دن وہ غائب ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اسے خطرناک قرار دیا کیوں کہ اب اس شخص کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایڈز میں مبتلا کرکے معاشرے سے انتقام لینا۔ لاقانونیت کے پروردہ اس معاشرے میں یہ کام بہت ہی آسان تھا۔ خون خریدنے والے اب بھی ایک سرنج پچاسوں افراد پر استعمال کرنے سے تائب نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اس شخص کے لیے ایڈز کیریئر کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ لیکن عاصم کو خبر پڑھنے کے بعد کی اپنی سوچ یاد تھی' اس کے خیال میں وہ انسان نہیں' پاگل کتا تھا جو بے سوچے سمجھے دوسروں کو کاٹ کر موت سونپنے کے لیے نکلا تھا۔

اب وہ اس شخص کو سمجھ سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود بھی اس جیسا ہو گیا تھا۔ اسے بھی کسی پاگل کتے نے کاٹ کر موت کے جراثیم سونپ دیئے تھے۔ اس وقت اس نے نہیں سوچا تھا مگر اب وہ سوچ سکتا تھا کہ شاید وہ شخص بے قصور ہو گا۔ بغیر کوئی گناہ یا آوارگی کیے وہ اس مرض میں مبتلا ہوا ہو گا۔ ایسے کسی شخص کا ردعمل اتنا تند و شدید ہو سکتا ہے' جسے احساس ہو کہ اس کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ وہی انتقام لینے کی سوچ سکتا ہے۔ خود اس نے بھی تو یہی سوچا تھا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا۔ گناہ گار آدمی تو یہ معلوم ہونے پر گناہ کے بے کراں بوجھ تلے دب کر رہ جائے گا' وہ تو سہم جائے گا۔

اب اسے اپنا ردعمل اور خدا سے اپنی خفگی یاد آئی۔ اسے غلطی کا ---- توبہ کی ضرورت کا احساس ہونے لگا۔ بنیادی طور پر اس کے سوچنے کا انداز ہی غلط تھا اور

ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے اب درست کرلیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ ایڈز خدا کا قہر ہے۔ اس اعتبار سے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس کا ردعمل اسی لیے اتنا شدید تھا۔ اسے زعم پارسائی جو تھا۔ مواقع حاصل ہونے کے باوجود وہ اس معاملے میں کبھی نہیں بہکا تھا لہٰذا وہ اس سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس ایک گناہ سے محفوظ سہی لیکن ہر گناہ سے محفوظ ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ جب کہ وہ جانتا تھا کہ پیغمبروں اور ولیوں کو چھوڑ کر کوئی نیک سے نیک عام انسان صرف اپنے اعمال کے بل پر بخشش نہیں پا سکتا۔ صرف اللہ کی رحمت کے زور پر ہی آخرت سنور سکتی ہے۔ وہ خدا کے متعلق بے انصافی کا خیال دل میں لایا۔ حالانکہ وہ کبھی بے انصافی نہیں کرتا بلکہ اس سے تو انصاف نہیں' رحم طلب کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ جاننے والا' آدمی کے پل پل سے واقف اگر انصاف کرے گا تو دنیا میں کون ایسا ہو گا' جو مجرم ثابت ہونے سے بچ پائے گا۔

پھر ایک اور زاویہ بھی تھا۔ معاشرے کی خرابی سے فرد بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی معاشرہ اللہ تعالیٰ کے قہر کی زد میں آتا ہے تو اس میں بچتا تو کوئی بھی نہیں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ اسے یاد آیا اس نے کسی کتاب میں یا اخبار کے کالم میں پڑھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی معاشرے کو تباہ کرنے کا حکم دیا۔ جبریل امین' اس کام کے لیے گئے لیکن لوٹ آئے۔ عرض کیا کہ خداوند کریم' وہاں ایک ایسا بندہ بھی ہے جو عابد و زاہد ہے' نیک ہے۔ اس میں تو وہ بھی ہلاک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم میرے حکم پر عمل کرو۔ وہ عبادت گزار بھی گناہ گار ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے میرے احکامات کی کھلی خلاف ورزی ہوتی رہی اور اس نے آواز تک نہ اٹھائی۔ چنانچہ وہ بستی تباہ کر دی گئی۔ تو یہ ایک حوالہ یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ معاشرے کی ذمے داری فرد پر بھی عائد ہوتی ہے۔ معاشرے میں کوئی برائی فروغ پانے لگے تو اس کے ہر فرد پر اس برائی کے خلاف حسب حیثیت جہاد فرض ہوتا ہے۔ طاقت ور ہو تو اس پر فرض ہے کہ وہ اس برائی

کو بہ جبر روکے، سختی سے ٹوکے، کمزور ہو تو اس کے خلاف زبان سے جہاد کرے۔ بہت زیادہ کمزور ہو اور کسی طرح کے احتجاج کے قابل نہ ہو تو اپنے ردعمل سے اس کی مذمت کرے اور اس برائی میں ملوث لوگوں سے نفرت کرے، ان کا بائیکاٹ کرے، ان سے قطع تعلق کرلے۔ اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ برائی کا آغاز ہمیشہ چھوٹے پیمانے پر ہوتا ہے اور اکثریت جو کہ بڑی طاقت ہوتی ہے، ابتدا ہی میں اس کا خاتمہ کر دینے کی قدرت رکھتی ہے۔ ہر جرم پہلے ڈھکے چھپے ہوتا ہے لیکن جب اکثریت اس پر احتجاج نہیں کرتی تو یہ اس کی توثیق کے مترادف ہوتا ہے۔ پھر مجرموں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ وہی سب کچھ کھلے بندوں ہونے لگتا ہے یوں اکثریت اس میں ملوث ہو جاتی ہے پھر جرم، جرم اور گناہ، گناہ نہیں رہتا۔ تو اس کی بڑی ذمے داری تو اکثریت ہی کی ہوئی نا۔ اسی لیے قہر سب کے لیے یکساں ہوتا ہے۔

اب جو اس نے سوچا تو خود کو کم گناہ گار نہیں پایا۔ مادیت کے اس دور میں رشوت لینے والے کی عزت کی جاتی ہے کہ وہ دولت مند ہوتا ہے اور رزق حلال کمانے والا غریب بے عزت ہوتا ہے تو یہ تو برائی کی عزت ہوئی نا۔ اور یہ سب کچھ وہ خود بھی کرتا رہا تھا۔ وہ دولت کے اعتبار سے بہت طاقت ور تھا۔ پھر وہ کیوں بروں کی عزت کرتا اور اچھوں کو نظرانداز کرتا رہا۔ اس نے برائیوں میں ملوث لوگوں سے نفرت نہیں کی۔ ان کا بائیکاٹ نہیں کیا۔ یقیناً وہ بھی مجرم ہے اس کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں ہوئی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس پر لرزہ چڑھ گیا۔ اس وقت اس کے جسم کا رواں رواں توبہ کر رہا تھا۔

اور جو رویہ اس کا تھا وہی پورے معاشرے کا تھا۔ دنیاوی قانون کے معاملے میں بھی لوگ مجرم سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ ہاں ----- سزا ہونے کے بعد ----- سزا کاٹنے کے بعد وہ ان کے لیے قابل نفرت ٹھہرتا تھا اور اب سماوی قانون کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ نفرت گناہ سے نہیں، سزا یافتہ سے کی جاتی تھی۔ شاید جرم بے وقوفی کی

پاداش میں ----- کہ اس نے خود پر جرم ثابت کیوں ہونے دیا۔ استغفراللہ!

تیسری حقیقت یہ تھی کہ نااہل، خود غرض اور بددیانت حکمراں سب سے بڑے مجرم تھے!

حکمرانوں کی باقی کمزوریاں ایک طرف، ایڈز کے معاملے میں ان کی مجرمانہ غفلت ناقابل معافی تھی۔ ایڈز کے متعلق لوگوں کو کچھ بتایا ہی نہیں گیا، عملی اقدامات تو دور کی بات تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی کہ ہر شخص کا خون لے کر تجزیہ کرایا جائے یوں ایڈز کے مریضوں کی درست اور حتمی تعداد سامنے آ جاتی۔ پھر انہیں ہسپتالوں میں داخل کردیا جاتا تاکہ وہ نہ اچھوت بنیں اور نہ اس کو پھیلانے کا سبب بنیں۔ یہ قانون بنایا جا سکتا تھا کہ اگر کوئی ایک سرنج ایک سے زیادہ افراد پر استعمال کرنے کا مجرم پایا گیا تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ تمام پرائیویٹ بلڈ بینکوں کو غیرقانونی قرار دے کر بند کیا جا سکتا تھا۔ لوگوں کو یہ آگہی دینے کی کوشش کی جاتی کہ دین فطرت اسلام نے فطری تقاضوں کو اخلاقی ضابطوں کا پابند کیا ہے اور اتنی سختی سے کہ ان کی خلاف ورزی پر سخت ترین سزا رکھی گئی ہے تو صرف اس لیے کہ اس میں انسانوں کی بہتری ہے۔ ہونا تو یہ کچھ چاہیے تھا لیکن ہو کچھ اور رہا تھا۔ ایڈز کے مریضوں کی تعداد چھپائی جا رہی تھی۔ یہ افواہ عام تھی کہ ایڈز کے مریضوں کو علاج کے نام پر ختم کر دیا جاتا ہے ----- قانونی قتل! سب سے بڑی بات یہ کہ "احتیاط ہی آپ کا واحد بچاؤ ہے ایڈز کے خلاف۔" کی تشہیر ترغیبی انداز میں کی جارہی تھی۔ بدکاری ترک کرنے کی تنبیہہ کی بجائے لوگوں کو اس سلسلے میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے مشورے دیئے جا رہے تھے۔

مختصر یہ کہ مراعات یافتہ طبقے کے لوگ بدترین مجرم تھے۔ وہ بدترین سزاؤں کے مستحق تھے!

اور وہ انتقام لینے نکلا تھا تو کن لوگوں سے۔ اپنے جیسے لوگوں سے، نائی کے استرے، قینچی، آفٹر شیو لوشن اور پاؤڈر پف کی زد میں کون آتا؟ اس جیسا کوئی انسان، جو انکشاف

ہونے پر ڈاکٹر سے کہتا یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر؟ میں نے تو بے حد صاف ستھری زندگی گزاری ہے۔ احتیاطی تدابیر کے سائے میں بدکاری کرنے والا کوئی شخص اس کے انتقام کی لپیٹ میں نہیں آ سکتا تھا۔

تو گویا اس کی اپروچ ہی غلط تھی!

اور اب اسے تجزیہ کرنا اور اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

اس نے سوچا ممکن ہے خدا اس سے کوئی کام لینا چاہتا ہو۔ ورنہ وہ جس کیفیت میں تھا اس سے نکلنا ناممکن ہی تھا مگر اسے ہوش آ گیا تھا اور وہ ہوش مندوں کی طرح سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اب اسے کوئی ڈر، کوئی خوف نہیں تھا۔ موت ایک ناگزیر حقیقت تھی۔ اب جتنی مہلت خدا اسے عنایت فرمائے۔

بہت غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے دو مختلف سمتوں میں کام کرنا ہوگا۔ ایک عام اور کمزور لوگوں کی ناکردہ گناہوں کے عذاب سے بچنے میں مدد اور دوسرے بدکار لوگوں کو جلد از جلد ان کے انجام تک پہنچانے میں تعاون۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ دونوں خاکوں میں جزئیات کا رنگ بھرنے میں مصروف ہو گیا۔

وسائل یعنی دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی مگر اسے دونوں کاموں کے لیے دو قابل اعتماد ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ ایک فیلڈ کے لیے تو اس کے پاس آدمی موجود تھا۔ بابر امریکہ میں تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ فون پر اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تقسیم اسناد کی تقریب کے فوراً بعد وہ وطن واپس آئے گا۔ عاصم نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے کہاں پہنچنا اور کس نام کے آدمی سے ملاقات کرنی ہوگی۔ بابر پر وہ مکمل اعتماد کر سکتا تھا۔ اپنے مطلب کے دوسرے آدمی کی تلاش کچھ مشکل نہیں تھی۔

اب بس اسے پُرسکون رہ کر بابر کا انتظار کرنا تھا۔

☆==========☆==========☆

وحید نجمی کو فوزیہ قریشی سے وقت لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ شاید اپنے

شوہر کی گمشدگی کے معاملے میں میڈیا کے موثر ہونے پر یقین رکھتی تھی۔ اسے امید تھی کہ اخبارات اس سلسلے میں بے حد معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

نجمی کی منزل کلفٹن کے علاقے میں چھ کمروں کا ایک لگژری فلیٹ تھا۔ گیٹ پر اسے روکا گیا۔ سیکیورٹی گارڈ نے اس کے اخبار کا شناختی کارڈ دیکھا پھر انٹرکام پر کسی سے رابطہ کیا۔ "مسز قریشی، نجمی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔" چند لمحے وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا، پھر بولا۔ "جی بہتر" وہ نجمی کی طرف مڑا۔ "آپ چھوٹے گیٹ پر آئیں، میں اسے کھول رہا ہوں۔"

نجمی چھوٹے گیٹ کی طرف گیا جو اسی لمحے کھول دیا گیا۔ "آٹھویں منزل، فلیٹ نمبر سی ۸۴" گارڈ نے کہا۔ "لفٹ موجود ہے۔"

وسیع و عریض لابی میں لفٹ موجود تھی۔ آٹھویں منزل پر اتر کر اس نے فلیٹ سی ۸۴ کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ نجمی کو اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ آواز سن کر اس نے اندازہ قائم کیا تھا کہ فوزیہ قریشی کوئی تھکی ہوئی، مضمحل سی، ادھیڑ عمری کی حدوں کو چھوتی ہوئی عورت ہوگی۔ لیکن وہ اس کے اندازے سے کہیں کم عمر تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ دو ڈھائی ماہ کی پریشانی اس پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اس کے باوجود وہ خوب صورت اور تروتازہ لگ رہی تھی۔ عمر اس کی تیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھی لیکن چہرے پر آنکھوں کے نیچے کچھ تازہ لکیریں نظر آ رہی تھیں۔

"آئیے نجمی صاحب، اندر آ جائیے۔" اس کی آواز بھی بے حد مترنم تھی۔

نجمی اندر چلا گیا۔ وہ ایک بہت کشادہ ڈرائنگ روم تھا جس کا فرنیچر اور آرائش دیدنی تھی۔ امارت سے زیادہ وہ سلیقے اور خوش ذوقی کی مظہر تھی۔ فوزیہ کے اشارے پر وہ ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ فوزیہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "کیا پئیں گے آپ؟ دیکھئے تکلف نہ کیجئے گا۔"

"کافی پلوا دیں۔"

"ثمینہ ----" فوزیہ نے اندر کسی کو آواز دی۔ "کافی لے آؤ۔" پھر وہ نجمی کی طرف متوجہ ہوئی۔ "میں آپ کی آمد پر شکرگزار ہوں آپ کی۔"

نجمی کو حیرت ہوئی۔ "شکرگزار تو مجھے ہونا چاہیے۔"

"چلیں، یہ شکرگزاری دو طرفہ سہی۔ حرج کیا ہے اس میں۔"

"کوئی حرج نہیں۔ بہرحال آپ کے خلوص کا شکریہ ----"

"خلوص!" وہ تلخی سے ہنسی۔ "آج کل جس کیفیت سے میں گزر رہی ہوں، اس میں اپنے اور اپنے بچوں کے سوا کسی سے خلوص نہیں برت سکتی میں۔ آپ اس صاف گوئی پر برا نہ مانئے گا۔ میں عام طور پر جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی۔ اس وقت مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے صحافی ہیں۔ انوسٹی گیشن آپ کی فیلڈ ہے۔ بااثر حلقوں تک آپ کی رسائی ہے۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

نجمی کو وہ عورت بے حد مختلف، بے حد بھلی لگی۔ وہ عام دولت مندوں کی طرح بے نیازی ظاہر کرکے کام نکلوانے کی قائل معلوم نہیں ہوتی تھی۔ پھر اسے اس پر ترس آنے لگا۔ بے چاری کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا شوہر کس طوفان میں گھرا ہوا ہے اور کس انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کی صاف گوئی مجھے بہت اچھی لگی بیگم قریشی۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں لیکن فی الحال تو مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

فوزیہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک خوب صورت لڑکی کافی کی ٹرے لے آئی۔ اس کی عمر ۲۴ سال سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ وہ نہ صرف بلا کی حسین تھی بلکہ اس کے انداز میں بے حد وقار بھی تھا۔ اس نے کافی کی پیالی پہلے نجمی اور پھر فوزیہ کے سامنے رکھی اور بغیر ایک لفظ کہے اندر چلی گئی۔

کافی کا گھونٹ لینے کے بعد نجمی نے مستفسرانہ نظروں سے فوزیہ کو دیکھا۔

"یہ ثمینہ ہے۔ ہمارے بچوں کی گورنس۔" فوزیہ نے بتایا۔ "بہت پیاری لڑکی ہے

چار سال سے ہمارے ساتھ ہے۔ اب تو مجھے سہیلی سی، بہن سی لگتی ہے۔ بچے بہت مانوس ہیں اس سے۔ اس وقت یہ نہ ہوتی تو ----" فوزیہ نے بات نامکمل چھوڑ دی اور ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

وحید نجمی یونہی ایک کامیاب تفتیشی رپورٹر نہیں بن گیا تھا۔ اس نے کم عمری میں ہی سیکھ لیا تھا کہ انسان کے منہ سے نکلا ہوا ہر جملہ، ہر لفظ اس کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتا ہے۔ پھر اس نے غور سے سننے اور نہایت تیزی سے نتائج اخذ کرنے کی مشق بھی کی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ فوزیہ اپنے گمشدہ شوہر سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس نے بچوں کا تذکرہ "ہمارے بچے" کہہ کر کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ خواہ اس کا شوہر اس کا اہل نہ ہو لیکن یہ طے تھا کہ اسے اپنے شوہر پر اندھا اعتماد ہے ورنہ وہ اتنی خوب صورت اور اپنے سے کم عمر لڑکی کو گھر میں نہ رکھتی۔ ایک تفتیشی رپورٹر ہونے کی حیثیت سے یہ بھی نجمی کا مزاج تھا کہ وہ ہر چیز، ہر بات اور ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تاآنکہ وہ پوری طرح درست ثابت نہ ہو جائے۔

فوزیہ نے اسے چونکا دیا۔ "تو آپ عاصم کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں! میں آپ سے بہت کچھ پوچھوں گا بشرطیکہ آپ برا نہ مانیں۔"

"جو جی چاہے پوچھیں۔ میں برا نہیں مانوں گی۔ کسی سے مدد یونہی تو نہیں مل سکتی اور میں تو غرض مند ہوں۔"

نجمی نے چونک کر اسے دیکھا لیکن نہ اس کے لہجے میں کوئی کاٹ تھی، نہ چہرے پر بدمزگی کا سایہ ---- وہ بس حقیقت پسند ثابت ہو رہی تھی۔ "شکریہ بیگم قریشی!" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "پہلے مجھے یہ بتائیں کہ یہ ثمینہ آپ کا انتخاب ہے یا قریشی صاحب کا؟"

ایک لمحے کو فوزیہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔ نجمی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن فوزیہ نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ "آپ یقیناً بہت اچھے انوسٹی

گیٹر اور صحافی ہیں۔" آخرکار وہ بولی۔ "یہ سوال نیچرل ہے۔ ایک گمشدہ شخص کی بیوی سے کیا جانے والا پہلا سوال۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں اور عاصم فیصلے مل کر کرتے تھے۔ ثمینہ میرا انتخاب تھی لیکن عاصم نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ ہم دونوں اس بات کے قائل تھے کہ بچوں کی گورنس میں خوش اطواری' خوش گفتاری اور خوب صورتی ----- سبھی کچھ ہونا چاہیے۔"

"ثمینہ یہیں رہتی ہے؟"

"ہاں۔ اس کے ماں باپ بچپن میں مرگئے تھے۔ خالہ نے پالا پوسا۔ اسے ہمارے ہاں آئے پانچ چھ مہینے ہوئے تھے کہ اس کی خالہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب یہی اس کا گھر ہے۔"

"آپ کے خیال میں عاصم اس اعتماد کے اہل ہیں؟ میرا مطلب سمجھ رہی ہے نا آپ؟"

فوزیہ کی آنکھوں میں برہمی چمکی۔ "خوب سمجھ رہی ہوں۔ آپ اہلیت کا پوچھتے ہیں۔ عاصم پر اعتماد کے سوا کچھ کیا ہی نہیں جاسکتا۔"

"اچھا ---- اب شروع سے بتائیں۔ وہ گھر سے یہ کہہ کر نکلے کہ امریکہ جارہے ہیں؟"

"جی ہاں اور انہوں نے کہا تھا کہ واپسی میں ایک ماہ لگ جائے گا۔ ایک ماہ گزر چکا تو مجھے پریشانی ہوئی۔ میں نے سفارت خانے سے رابطہ کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ عاصم کو ویزا جاری ہی نہیں کیا گیا۔ امریکہ میں پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ کیا گیا۔ وہاں سے بھی نفی میں جواب میں ملا۔ پھر میں نے گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ------ مگر اب تک-----"

نجمی نے اس کی بات کاٹ دی۔" آپ کے خیال میں یہ کس نوعیت کا کیس ہے؟"

"میں ----- میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے۔" فوزیہ بے بسی سے بولی۔ "عاصم امریکہ نہیں گئے۔ کم از کم اصلی نام سے تو نہیں گئے۔ انہوں نے اپنے تمام اثاثے فروخت کر دیئے۔ ۹۰ کروڑ کی غیر معمولی رقم ہے ان کے پاس۔ میں بس یہ ہی دعا کرتی رہتی ہوں کہ خدا انہیں اپنی امان میں رکھے۔"

"آپ سے کوئی ان بن تو نہیں ------؟"

"نہیں۔"

"آثار بتاتے ہیں کہ وہ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت آپ کو اور بچوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ کیوں؟"

"مجھے تو اس پر یقین نہیں آتا۔ اس کا کوئی جواز ہی موجود نہیں۔"

"کوئی عورت؟"

"آپ انہیں بالکل نہیں جانتے نجمی صاحب ------" فوزیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے کہہ دیتے اور میں شرع کے مطابق ان کے حق میں کبھی مداخلت نہ کرتی بلکہ میں ان کے ساتھ پورا تعاون کرتی۔"

"روانگی سے پہلے آپ نے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی تھی ان میں؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ لگتا تھا تصور میں سب کچھ دہرا کر دیکھ رہی ہے۔" وہ کچھ چپ چپ تھے اس رات۔" آخرکار اس نے کہا "اور سوتے وقت دونوں بچوں کو لپٹائے رہے تھے۔ صبح انہیں دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ رات سو نہیں سکے ہیں۔ اب یہی یاد مجھے لرزا دیتی ہے۔ یعنی وہ جانتے تھے کہ وہ بچوں سے جدا ہو رہے ہیں۔ وہ سوچ سمجھ کر ہمیں چھوڑ کر گئے ہیں۔"

"یوں غائب ہونے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں۔" نجمی نے کہا۔ "پھر آپ کا کیا خیال ہے کہ کیا ہوا ہوگا؟"

"سوچتی ہوں تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔" فوزیہ بولی۔ "لیکن یہ خیال مجھے ہمیشہ آتا

ہے کہ ممکن ہے ان پر کسی گروہ کا دباؤ ہو۔ دولت ہتھیانے کے لیے ------ اور خدانخواستہ ------" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ "دیکھیں ناں ------ آج کل تو اس طرح کی کاروائیاں عام ہو گئی ہیں۔" اب اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"اور یہ امکان بھی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے، آزادانہ کسی اور انداز کی زندگی گزارنے گئے ہوں۔" نجمی نے خیال آرائی کی۔

فوزیہ کی بھویں تن گئیں۔ "آپ جلدی میں تو نہیں نجمی صاحب؟"

"جی نہیں۔"

"تو آیئے میرے ساتھ۔"

وہ اسے ڈرائینگ روم کے اندر والے دروازے سے گزار کر ایک راہ داری میں لے گئی۔ اس بار وہ جس کمرے میں داخل ہوئے، اس نے نجمی کو حیران کر دیا۔ وہ ہر اعتبار سے مکمل ایک ویڈیو روم تھا۔ کونے میں ٹرالی پر ٹی وی اور وی سی آر رکھا تھا۔ شو کیس میں ایک ویڈیو کیمرا رکھا تھا۔ دیواروں پر شیلف تھے جن میں ویڈیو کیسٹ سلیقے سے رکھے تھے۔ وہ پوری ویڈیو لائبریری تھی۔ وہاں چار شیلف تھے تین بڑے اور ایک چھوٹا ------ دو میں اردو فلمیں تھیں ایک میں انگریزی ------ اور چھوٹے شیلف میں چٹ لگی تھی ------ "پرسنل۔"

"عاصم کو ویڈیو کا خبط ہے۔" فوزیہ نے بتایا "وہ خود بھی شوٹ کرتے رہتے ہیں۔ بچوں کا ہر یادگار لمحہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔" وہ پرسنل کیسٹ والے شیلف کی طرف بڑھ گئی۔ شیلف سے ایک کیسٹ نکال کر وہ ٹرالی کی طرف بڑھی۔ اس نے کئی سوئچ دبائے۔ کمرا روشن ہو گیا۔

کیسٹ وی سی آر میں لگا کر وہ خود بھی ایک آرام دہ کرسی میں آ بیٹھی۔ ٹی وی آن تھا۔ اسکرین پر مکھیاں سی اڑتی نظر آ رہی تھیں۔ کیسٹ ری وائنڈ ہو رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد وی سی آر پر پلے روشن ہوا اور اگلے ہی لمحے ٹی وی اسکرین پر دو خوب صورت اور

من موہنے بچے نظر آئے۔

نجمی محو ہو کر دیکھتا رہا۔

انسانی نفسیات کو سمجھنا وحید نجمی کے لیے فطرت ثانیہ کی حیثیت رکھتا تھا اور جو کچھ اسکرین پر اسے نظر آ رہا تھا، وہ براہ راست دل کو چھو رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے خوش حال گھرانے کی ننھی منی معصوم سی خوشیاں تھیں۔ معصوم اور بے ساختہ خوشیاں۔ یہ بات واضح تھی کہ عاصم اپنی بیوی اور بچوں کو والہانہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت ہی محبت ہوتی تھی۔ وہ آنکھیں چھلک رہی ہوتی تھیں۔

وہ کوشش کے باوجود اس محبت کو جھوٹ اور کھوٹ قرار نہ دے سکا۔ وہ ایک کروڑ پتی کی چھوٹی سی زمینی جنت تھی جس کا منظر منہ سے بول رہا تھا کہ اس جنت کو دولت کا کوئی چشمہ زندگی نہیں دے رہا ہے۔ وہ ایک مکمل جنت تھی اور بچوں پر جان چھڑکنے والا اور بیوی سے والہانہ محبت کرنے والا وہ شخص ایڈز کا مریض تھا ------ ایڈز کا! یہ کیسی انہونی ہے۔

"یہ ہے آپ کے سوال کا جواب۔" فوزیہ نے اسے چونکا دیا۔ "یہ ہے میرے شوہر کا طرز زندگی اور میں پوری دیانت داری سے محسوس کرتی ہوں کہ وہ اس سے مطمئن تھے۔ اب یہ آپ سوچیں کہ ممکن ہے وہ کسی اور انداز کی زندگی گزارنے نکل کھڑے ہوئے ہوں۔"

نجمی اسے بغور دیکھتا رہا۔ اس کے لہجے میں اب بھی طنز نہیں تھا۔ "اس کیسٹ نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔" وہ بولا۔

"اب اسے آف کر [illegible]

"جی شکریہ۔"

وہ دوبارہ ڈرائینگ روم میں آ بیٹھے۔ "اور کافی پیئیں گے؟" فوزیہ نے اس سے پوچھا۔

"سچ پوچھیں تو مجھے ضرورت محسوس ہو رہی ہے کافی کی۔"

فوزیہ اندر چلی گئی۔ نجمی بیٹھا سوچتا رہا۔ ایڈز کا مریض اور اس طرح کا بیک گراؤنڈ۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے ڈاکٹر نجیب کی بات بھی یاد تھی۔ عاصم قریشی نے اس سے بے حد یقین سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا اور بیک گراؤنڈ تائید کر رہا تھا کہ عاصم اپنے یقین میں سچا ہی ہو گا۔

فوزیہ پھر واپس آ گئی تھی۔ "کافی ابھی آ رہی ہے۔" اس نے کہا۔ "اور بھی کچھ پوچھنا ہے تو بے تکلفی سے پوچھیں؟"

"بس ایک اہم بات اور۔ مجھے اپنے شوہر کے کردار کے بارے میں بتائیے؟"

فوزیہ، ثمینہ کے ٹرے رکھ کر جانے تک خاموش رہی۔ پھر اس نے کافی کی پیالی نجمی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت اچھے شوہر، بہت اچھے باپ اور بہت اچھے انسان ہیں۔ خامیوں سے پاک تو کوئی نہیں ہوتا لیکن عاصم میں خوبیاں بہت زیادہ ہیں۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں؟" نجمی نے دھیرے سے کہا۔ "وہ کروڑ پتی ہیں، دولت مندوں کے کچھ شوق بھی ہوتے ہیں۔ اونچی سوسائٹی میں انہیں معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ میرا مطلب ہے، عورتیں وغیرہ-----"

فوزیہ کا چہرہ تمتما اٹھا تھا تاہم اس نے حیرت انگیز طور پر خود پر قابو رکھا۔ "مجھے عاصم پر فخر ہے۔" اس نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ لفظ عصمت اور اس کی پاکیزگی کو عورتوں تک محدود نہیں رکھتے۔ کوئی کسی کے لیے ایسی قسم نہیں کھا سکتا لیکن میں عاصم کے کردار کی قسم کھا سکتی ہوں۔"

نجمی پھر حیران رہ گیا----- یہ کس قسم کا شخص تھا۔ اس دنیا کا آدمی تو نہیں لگتا تھا۔

"اچھا، آپ مجھے ان کے کسی قریبی دوست کا نام بتائیں۔" اس نے کہا "کوئی ایسا شخص جس سے وہ بہت قریب ہوں۔"

"ان کے ایک ایسے دوست سے تو آپ اس وقت ہم کلام ہیں۔" فوزیہ نے بڑے

اعتماد سے کہا۔ "دوسرے دوست کا نام خاور ندیم ہے، تنظیم انڈسٹریز والے۔"

"بہت بہت شکریہ بیگم قریشی۔ آپ نے مجھ سے مثالی تعاون کیا ہے۔" نجمی نے بے حد خلوص سے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم ہو گا تو میں پہلے آپ سے رابطہ کروں گا۔" وہ اٹھنے لگا۔

"ایک منٹ۔ آپ نے میری مدد کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب ایک بات میں بھی کہوں۔ برا نہ منائیے گا اور اسے گھٹیا پن نہ سمجھیے گا۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔ اس کام کے سلسلے میں آپ کو جتنی بھی ضرورت پڑے، آپ مجھ سے طلب کر لیں۔"

"میں یہ کام بلامعاوضہ کر رہا ہوں۔" نجمی نے خشک لہجے میں کہا۔

فوزیہ نے ایک گہری سانس لی۔ "حیرت ہے۔ آپ صحافی ہو کر انسانوں کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ میں نے معاوضے کی بات نہیں کی تھی۔ بہرحال اسے ذہن میں رکھیے گا۔"

"شکریہ، ہاں ایک بات اور، آپ کا کوئی ذاتی اکاؤنٹ ہے؟"

فوزیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "جی ہاں۔"

"تو ذرا اسے چیک کیجئے گا۔ کوئی خاص بات ہو تو مجھے مطلع کیجئے گا۔ یہ رہا میرا کارڈ۔"

☆===========☆===========☆

خاور ندیم سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ وہ امریکہ گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی دو ہفتوں بعد متوقع تھی۔ نجمی نے اس دوران اس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لیں۔ اس کے علاوہ اس نے عاصم کی سیکرٹری رعنا سے بھی ملاقات کی تھی لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ عاصم صرف ایک بار اپنے دفتر آیا تھا۔ اس روز، جس روز بظاہر وہ امریکہ روانہ ہو چکا تھا۔ رعنا کی ملازمت برقرار تھی۔ عاصم نے نئی انتظامیہ سے سفارش کی تھی کہ وہ کام کی کارکن ہے اور دفتری معلومات کو خوب سمجھتی

ہے۔

نجمی نے انٹرکان کو بھی چیک کیا تھا۔ ہوٹل سے معلوم ہوا کہ قیام کے دوران عاصم اپنے کمرے تک ہی محدود رہا تھا۔ کھانا اور ناشتہ وہ روم سروس کے ذریعے منگواتا رہا تھا۔ ایک ہفتے کے قیام کے دوران وہ صرف دو بار کہیں باہر گیا تھا۔ دوسری بار چیک آؤٹ ہونے سے صرف ایک دن پہلے۔ اور اس موقع پر وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو بھاری سوٹ کیس بھی تھے۔ اگلے روز وہ رخصت ہو گیا تھا۔ وہ پیلی ٹیکسی میں گیا تھا۔ نجمی نے ہوٹل کے باہر ریگولر کھڑی ہونے والی پیلی ٹیکسیوں کے ڈرائیوروں سے پوچھ گچھ کی لیکن بات بنی نہیں۔ تاہم اس نے چند ڈرائیوں سے استدعا کی کہ وہ اس سلسلے میں دوسرے ڈرائیوں کو ٹٹولتے رہیں۔ کام کی معلومات حاصل ہونے پر انہیں معقول انعام ملے گا۔

یہ وہ مقام تھا' جہاں سے عاصم قریشی کے نقوش پا ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔

اب نجمی نے اس کے متعلق چھان بین شروع کی۔ صنعتی اور تجارتی حلقوں کے لوگوں سے ملا۔ اس کلب کے ممبروں سے بات چیت کی' جس کا عاصم قریشی ممبر تھا۔ وہاں سے فوزیہ کی باتوں کی تصدیق و تائید کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا۔ تمام جاننے والوں کے نزدیک عاصم قریشی ایک فرشتہ تھا۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ایسی دولت کا کیا فائدہ جس سے آدمی لطف اٹھانے کی کوشش بھی نہ کرے۔ عاصم اپنی سوسائٹی کی نجی قسم کی محفلوں میں کبھی شریک نہیں ہوتا تھا بلکہ اب تو لوگوں نے اسے مدعو کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اسے پینے پلانے کا شوق بھی نہیں تھا۔ اپنے طبقے کے لوگوں میں وہ "نرا بور" مشہور تھا۔ عورتیں اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کی توقعات پر پورا جو نہیں اترتا تھا۔

کلب کے ممبروں کے کہنے کے مطابق ٹینس وہ صرف ایکسرسائز اور فٹنس کی نیت سے کھیلتا تھا۔ اس کا گیم واجبی سا تھا۔ شطرنج کا البتہ وہ بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ کسی زمانے میں وہ ہر سال کلب کا چیس ٹورنامنٹ جیتتا تھا۔ شادی کے بعد اس کا کلب آنا اور شطرنج

میں دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ البتہ جمعرات کے دن وہ اب بھی کلب ضرور آتا تھا۔

اور اب نجمی ان معلومات کو مربوط کرکے ایک خاکہ بنانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ عاصم قریشی کی شخصیت ہر قدم پر اسے حیران کر رہی تھی۔ وہ بے داغ کردار کا مالک ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے مخالفین بھی اسے زاہد خشک اور پارسا کے مترادفات استعمال کرکے گالی دیتے تھے۔ وہ ریزرو رہنے والا آدمی تھا۔ اس کا خاص دوست صرف ایک ہی تھا---- نہیں' ایک نہیں دو تھے۔ ایک فوزیہ قریشی اور دوسرا خاور ندیم۔ وہ زیادہ دوست بنانے کا قائل نہیں تھا۔ اس کی طبیعت میں دردمندی تھی۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد وہ فرض سمجھتا تھا۔ اس کے در سے کوئی سوالی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ اس شہر میں جہاں کسی کا عیب چھپائے نہیں چھپتا' اس کی عیاشی اور آوارگی کی ایک افواہ بھی نہیں ملی تھی۔ ایڈز کے ایک مریض کے لیے یہ ایک بہت پھیکا' بے رنگ اور مایوس کن منظر تھا۔

اچانک نجمی کے ذہن میں ایک لفظ گونجا' سیکرٹری! یہ ایک مسلمہ امر تھا کہ کسی شخص کے بارے میں اس کی سیکرٹری سب سے زیادہ معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ وہ رعنا سے ملا ضرور تھا مگر اس نے عاصم کی ذات کے بارے میں نہیں' صرف اس کی گمشدگی کے بارے میں بات کی تھی۔

نجمی نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بجے تھے۔ اس نے رعنا کے دفتر فون ملایا "اتحاد انڈسٹریز۔" دوسری طرف سے آواز ابھری۔

"آپ رعنا بول رہی ہیں نا؟"

"جی ہاں اور آپ شاید وحید نجمی ہیں' روزنامہ سویرا کے رپورٹر۔"

نجمی کو حیرت ہوئی۔ صرف ایک ملاقات کے بعد اس طرح آواز پہچان لینا! "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کس حیثیت سے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

نجمی کو شاک لگا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"اتحاد انڈسٹریز کی ملازم تو اب میں رہی نہیں۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ اب گھر جانے کے لے اٹھنے ہی والی تھی۔"

یہ اطلاع بھی شاک تھی۔ تاہم نجمی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میں جس حیثیت کی وجہ سے آپ سے ملنا چاہ رہا ہوں' وہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ وہ حیثیت یہ ہے کہ آپ کبھی عاصم قریشی صاحب کی سیکرٹری رہی ہیں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر رعنا کی آواز ابھری۔ "ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ اس حیثیت کو میں کبھی بھولوں گی بھی نہیں۔ اسی نے مجھے اعتماد دیا' سربلندی سے جینا سکھایا' نہ میں اپنی حیثیت کو بھولوں گی نہ عاصم صاحب کو۔"

لڑکی جذباتی ہو رہی تھی۔ "تو پھر میں آپ کے دفتر آ جاؤں۔"

"نہیں' یہاں تو میں ایک منٹ بھی نہیں رکنا چاہتی۔"

"تو پھر اپنا پتہ بتا دیجئے میں آپ کے گھر آ جاتا ہوں۔"

"یہ بھی مناسب نہیں۔" وہ ہچکچائی۔

"بس پھر ایسا کرتے ہیں کہ میں آپ کو دفتر سے لے لیتا ہوں۔ کہیں چل کر چائے پیئیں گے اور آن اے کپ آف ٹی ------"

وہ اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ تاہم چند لمحے کے بعد اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن آپ کو پہنچنے میں دیر لگے گی اور میں یہاں رکنا نہیں چاہتی۔"

"میں صرف پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے' میں باہر ملوں گی آپ کو۔" رابطہ منقطع ہو گیا۔

ریسیور رکھ کر نجمی جھپٹ کر اٹھا۔ ایسی ہنگامی صورت میں گھر سے نکلنا اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

ریسٹورنٹ تقریباً خالی تھا۔ نجمی نے کونے کی ایک میز منتخب کی تھی۔ رعنا چائے بنا

رہی تھی اور نجمی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ خود کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ بڑے صحافی بنے پھرتے ہو۔ ایک ایسی سیکرٹری کو نظرانداز کیسے کردیا تم نے؟ رعنا صرف خوب صورت اور شاداب لڑکی نہیں تھی۔ اس میں ایک طرح کی اپیل بھی بے پناہ تھی۔ وہی سب سے موثر اور فیصلہ کن شہادت دے سکتی تھی۔ اس کا حسن بلاشبہ زہد شکن تھا۔

نجمی کو حیرت تھی کہ اس نے پچھلی بار ہی یہ پوچھ گچھ کیوں نہیں کی؟

رعنا نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ "اب پوچھیں' کیا پوچھنا ہے آپ کو؟" وہ بولی۔

"وہ تو میں بعد میں پوچھوں گا۔ پہلے یہ بتائیے کہ ملازمت کیوں چھوڑ دی آپ نے؟"

رعنا نظریں چرانے لگی۔ پھر اس نے چائے کی پیالی پر جھکتے ہوئے کہا۔ "اس لیے کہ اب وہاں عزت سے کام کرنا ممکن نہیں رہا۔"

"کیا مطلب؟"

"اس سے زیادہ وضاحت میں نہیں کر سکتی۔"

نجمی نے پھر دل میں خود کو کوسا۔ واقعی وہ ڈفر ثابت ہو رہا تھا۔ اس بیان میں وضاحت کی ضرورت ہی کہاں تھی۔ "مگر آپ تو ------" اس نے کہا اور کہتے کہتے رک گیا۔ "کتنے عرصے سے یہ جاب کر رہی تھیں آپ؟"

"تقریباً آٹھ سال ہو گئے۔"

"اور عاصم صاحب ------"

"اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے۔ عاصم صاحب بہت عظیم انسان ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ جب میں پہلی بار جاب کے لیے گھر سے نکلی تو کتنی مجبور تھی۔ ایک حادثے میں میرے والد کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی تھیں۔ ہمارے گھر میں فاقے ہو رہے تھے۔ میرے چھ چھوٹے بہن بھائی تھے اور کمانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں بی اے کی طالبہ تھی۔ تلاش

رزق میں گھر سے نکلی تو مجبوری نے میرے ذہن کو شل کر دیا تھا۔ اس وقت میں آج کی طرح سر اٹھا کر اپنی عزت نفس کے لیے لڑنے کے قابل نہیں تھی۔ بھائی بہنوں اور ماں باپ کی بھوک نے مجھے کمزور کر دیا تھا اور میرے ساتھ احساس کمتری بھی تھا۔ میں صرف انٹر پاس تھی۔ مجھے ٹائپنگ تک نہیں آتی تھی۔ عملی زندگی کیسی ہوتی ہے' اس کا تصور تک نہیں تھا میرے پاس۔ خدا نے کرم کیا کہ مجھے عاصم صاحب تک پہنچا دیا۔ انہوں نے میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے اہلیت نہ ہونے کے باوجود مجھے ملازمت دی۔ مجھے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لیے مہلت اور حوصلہ دیا۔ پرائیویٹ تعلیم کے لیے حوصلہ افزائی کی۔ دفتری امور سکھائے۔ باہر کی دنیا سے متعارف کرایا۔ مجھے عزت دی اور عزت سے جینا سکھایا۔ انہوں نے اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ اہل اور تجربہ کار امیدواروں کو نظرانداز کر کے وہ ایک کم عمر' خوب صورت لیکن ملازمت کے لیے نااہل لڑکی کو جاب دے رہے ہیں تو ان کا سٹاف ان کے بارے میں کتنی غلط رائے قائم کرے گا۔" وہ کہتے کہتے رکی اور اس نے سر اٹھا کر محجوب نظروں سے نجمی کو دیکھا۔ "آپ کو عجیب لگے گا نجمی صاحب لیکن میں جانتی ہوں کہ میں غیر معمولی طور پر حسین ہوں۔ جس وقت عاصم صاحب نے مجھے ملازمت دی تو میں نے ایک فطری بدگمانی کی۔ میں نے سوچا' یہ بارٹر سسٹم کی عنایت ہے۔ عنایت کے بدلے عنایت اور میں ضرورت مند تھی اور اس کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی۔ لیکن عاصم صاحب نے مجھ پر جو احسان کیا' وہ جاریہ احسان ہے۔ وہ اب بھی جاری ہے۔ میں ڈرتی رہی کہ کسی بھی وقت مجھ سے عنایت کے صلے کا تقاضا کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ایک سپردگی بھی طاری رہی تھی مجھ پر۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور ایک سال ہو گیا تو میرا ڈر آہستہ آہستہ نکلنے لگا۔ صرف سپردگی رہ گئی اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔" وہ چند لمحے خاموش رہی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "اب تک جو کچھ میں نے کہا' آپ چاہیں تو اسے شائع کر سکتے ہیں مگر اب جو کچھ میں کہوں گی' وہ آف دی ریکارڈ ہے۔ بولیں کیا کہتے ہیں آپ؟"

سحر زدہ نجمی نے بے جان سے انداز میں سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

رعنا نے ایک گہری سانس لی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"لفظ تو دور کی بات ہے' عاصم صاحب کی آنکھ کے ایک اشارے پر میں اپنا وجود ان پر قربان کر سکتی تھی اور قربان کر سکتی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کون سا جذبہ ہے یا کسی جذبے کا کون سا درجہ ہے مگر یہ ہے بڑا سچا جذبہ۔"

بیرا بل لے آیا تھا۔ نجمی نے پلیٹ میں دو نوٹ رکھ دیئے۔ "باقی تم رکھ لینا۔" اس نے بیرے سے کہا۔ بیرا چلا گیا تو وہ رعنا کی طرف متوجہ ہوا۔ "اور اب یہ اچھی بھلی ملازمت آپ نے چھوڑ دی ہے۔ کیوں؟"

"میرے نئے باس کا خیال ہے کہ سیکرٹری کی حیثیت سے جو فرائض میں ادا کر رہی ہوں' اس کے علاوہ بھی میرے کچھ فرائض ہیں۔ اپنے اندر کی کمزوری کے عرصے میں' میں یہ بات تسلیم کر سکتی تھی مگر اب جب کہ میرے پاس ہر طرح کی اہلیت ہے' خود اعتمادی ہے اور میں سر اٹھا کر جینا سیکھ چکی ہوں تو یہ کیسے تسلیم کر سکتی ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" نجمی کے لہجے میں احترام تھا۔

"خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔"

نجمی چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ سمجھنا چاہتا تھا اس سے زیادہ سمجھ چکا ہوں۔"

رعنا نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی۔ "تو پھر چلیں؟"

"آیئے۔"

دونوں ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ "چلئے میں آپ کو رکشہ میں بٹھا دوں۔" نجمی نے کہا۔

"نہیں آپ اطمینان سے چلے جائیں۔ میں بس سے جاؤں گی۔"

نجمی چند لمحے ہچکچاتا رہا پھر اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر رعنا کی طرف بڑھایا۔

"یہ کارڈ رکھ لیجئے۔ دو تین دن میں مجھے فون کر لیجئے گا۔ ممکن ہے اس وقت تک میں آپ کے لیے کسی جاب کا بندوبست کر چکا ہوں۔"

رعنا نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ "شکریہ نجمی صاحب۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

☆============☆============☆

وحید نجمی کی نفسیات دانی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

رعنا سے دوسری ملاقات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ عاصم قریشی اس دنیا کا آدمی نہیں لگتا تھا۔ تاہم دنیا ابھی اچھے انسانوں سے خالی نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے عاصم قریشی کا وجود کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ ایڈز کا مریض تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ ایڈز میں مبتلا کیسے ہوا؟

ایڈز کے بارے میں اول تو بات کی ہی نہیں جاتی تھی مگر کچھ عرصے سے "نیشنل ایڈز پروگرام" اچانک ہی فعال ہو گیا تھا۔ اب ٹی وی پر کمرشل بھی آ رہے تھے اور اخبار میں اشتہارات بھی۔ لوگوں کو بتایا جا رہا تھا کہ ایڈز کیسے پھیلتا ہے۔ احتیاطی تدابیر پر زور دیا جا رہا تھا۔ یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ بلاواسطہ اور بالواسطہ ایڈز میں مبتلا ہونے کے امکانات برابر ہی ہیں۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ایڈز کے شکار سے نفرت نہ کریں۔ اسے اچھوت نہ بنا ڈالیں۔ اور شاید اس لیے بھی کہ مریض بھی اس خود فریبی میں مبتلا رہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس کے گناہوں کا شاخسانہ نہیں بلکہ بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ نجمی کے خیال میں جنسی بے راہ روی کے شکار لوگوں اور سرنج کے ذریعے منشیات استعمال کرنے والوں کے علاوہ کسی کے لیے ایڈز کا شکار ہونے کا امکان ہزار میں ایک تھا۔ لیکن لوگ جنہیں ایڈز کے بارے میں معلومات حاصل نہیں تھیں' وہ

یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔

ویسے احتیاط بہت ضروری تھی۔ ایڈز کے حوالے سے ہی نہیں' عام انسانی صحت کے لیے بھی۔ حجاموں کی دکانوں پر ایک استرے کا استعمال ویسے بھی اچھا نہیں تھا۔ لوگوں کو ایک دوسرے سے جلدی بیماریاں لگ سکتی تھیں اور کئی مریضوں پر ایک ہی سرنج کا استعمال تو بے حد مخدوش تھا۔

نجمی کے خیال میں نیشنل ایڈز پروگرام کے اشتہاروں میں دیا جانے والا تاثر ہر زاویے سے منفی پہلو رکھتا تھا۔ ایک طرف تو یہ تاثر ایڈز کے مریض کو خود ترسی میں مبتلا کرتا تھا۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یوں اس کے اندر انتقام کا جذبہ دیوانگی کی حد تک ابھر سکتا تھا۔ اور وہ بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف اس انداز کی مسلسل پبلسٹی نے نارمل زندگی گزارنے والے عام لوگوں کو خوف زدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ سیدھے راستے پر چلنے والے لوگ ایڈز کے اندیشے کے بوجھ تلے دبتے جا رہے تھے۔ یہ زیادتی تھی۔ نارمل لوگوں کو ابنارملٹی کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔ نجمی کتنے ہی ایسے لوگوں سے واقف تھا جو حجام کے پاس جانے سے گھبرانے لگے تھے۔ شیو تو خیر گھر پر کیا جا سکتا ہے لیکن بال ترشوانے کی تو مجبوری ہے۔ دوسری طرف ایسے مریض بھی تھے جنہیں ڈاکٹر خون ٹیسٹ کرانے کا مشورہ دیتا تو یا وہ صاف انکار کر دیتے یا پرچا لے کر کسی لیبارٹری کا رخ کرنے کی بجائے گھر آتے اور دوبارہ اس ڈاکٹر کے پاس نہ جاتے۔ جن مریضوں کو خون کی ضرورت ہوتی وہ خود بھی اور ان کے لواحقین بھی خون لینے سے ڈرتے۔ یعنی ایڈز کے خوف کے مارے دوسرے طریقوں سے اپنی صحت کو اتنا ہی نقصان پہنچا رہے تھے۔ تیسری طرف وہ لوگ جنہیں صحیح معنوں میں ایڈز کا خطرہ لاحق تھا' احتیاطی تدابیر پر عمل کر کے مطمئن تھے۔ انہوں نے اپنی روش نہیں بدلی تھی۔

یعنی محدود اور نامکمل آگہی سب کے لیے مہلک ثابت ہو رہی تھی۔ سبھی کے لیے عذاب بن گئی تھی!

نجمی کا خیال تھا کہ ایڈز کے ہزار مریضوں میں صرف ایک ایسا ہو سکتا ہے' جو بے قصور ایڈز کا شکار ہوا ہو اور لگتا تھا کہ اسے عاصم قریشی کو ہزار میں سے ایک تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ مگر اب بھی وہ اس سوچ سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا کہ عاصم کو بھی یہ مرض کسی سے لگا ہو گا وجہ یہ تھی کہ جتنے مضبوط اس بات کے شواہد تھے کہ عاصم کردار کے اعتبار سے ایک بڑا آدمی ہے' اتنی ہی جان دار اس بات کی دلیلیں تھیں کہ وہ بالواسطہ ایڈز کا کیس ہے۔

عاصم قریشی کروڑ پتی آدمی تھا۔ ایسا شخص جسے معاشرے میں وی آئی پی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے خون ٹیسٹ کراتا تھا لیکن پاک لیپ میں جو ملک بھر میں مانی ہوئی اور قابل اعتبار لیب تھی۔ وہاں ہر شخص کے لیے پیکنگ کھول کر نئی سرنج استعمال کی جاتی تھی اور استعمال کے بعد ضائع کر دی جاتی تھی۔ اس میں شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ یقیناً کسی بہت اچھی باربر شاپ میں جاتا ہو گا۔ وہاں پرانے زمانے والے استرے کے استعمال کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اب تو عام نائی بھی وہ استرے استعمال کرتے تھے جن میں پھل نہیں ہوتا بلکہ سینٹی بلیڈ کو نصف کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔

تو پھر عاصم قریشی ایڈز کا شکار کیسے ہوا؟ اگر وہ اتنا ہی صاحب کردار اور پارسا ہے جتنا کہ ہر شخص کہتا ہے تو ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ اس کی بیوی فوزیہ! یہ خیال آتے ہی نجمی چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے تصور میں باوقار فوزیہ کا سراپا لہرایا۔ کیا یہ ممکن ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ دل نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن صحافی کے تربیت یافتہ دماغ نے دل کو ڈپٹ دیا۔ "تم چپ رہو جذباتیت کے مارے۔ خوامخواہ ٹانگ نہ اڑایا کرو ہر معاملے میں۔ بس خون پمپ کرتے رہو۔" وہ دل جسے کبھی لفٹ نہیں ملی تھی' گھبرا کر جلدی جلدی خون پمپ کرنے لگا اور دماغ نے نجمی کے کان میں سرگوشی کی۔ کیوں نہیں۔ انسان سے کسی بھی خطا کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ شیطان نے سب سے پہلے کسے بہکایا تھا؟ اس حوا کو!

دل نہیں مانتا تھا کہ وہ ایسی ہو سکتی ہے لیکن نجمی صحافی تھا۔ بہت اچھا تفتیشی صحافی۔ وہ ہر شخص پر اس وقت تک شک کرنے کا قائل تھا جب تک اس کی برات ثابت نہ ہو جائے۔

تو اب اسے فوزیہ کو ٹٹولنا تھا مگر کیسے؟ وہ اس بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "نجمی اسپیکنگ۔"

دوسری طرف خاموشی رہی۔

"ہیلو کون ہے بھئی؟" اس بار اس کی آواز نسبتاً بلند تھی۔

پھر بھی چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ایک نسوانی آواز ابھری "نجمی صاحب' میں فوزیہ بول رہی ہوں۔ فوزیہ قریشی۔"

نجمی کو شاک لگا۔ کچھ یوں کہ اس وقت وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور کچھ اچھا نہیں سوچ رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ خاصے توقف کے بعد اس سے مخاطب ہوئی تھی اور اس کی آواز بھی بھرائی ہوئی تھی جیسے دیر تک روتی رہی ہو۔

"ہیلو' یہ وحید نجمی صاحب کا ہی نمبر ہے نا؟" اس بار فوزیہ کا لہجہ ہذیانی تھا۔

"جی ہاں مسز قریشی' میں نجمی بول رہا ہوں۔ فرمایئے!"

"آپ مصروف تو نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔ آپ کام بتایئے۔"

"میرے گھر آ سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" نجمی نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "میں دس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"شکریہ' خدا حافظ۔" ریسیور رکھ دیا گیا۔

نجمی کے بدن میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ ضرور کوئی اہم بات ہے۔ فوزیہ قریشی بہت اپ سیٹ لگ رہی تھی۔ کہیں--- کہیں--- کہیں----

☆============☆============☆

یہ اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ یہ دن اس کی زندگی کا خاص دن تھا جب تک امی زندہ تھیں' اس روز خاص اہتمام کرتی تھیں۔ اس کی پسند کے کھانے پکواتیں۔ اسے تحفے ملتے۔ پھر امی کے بعد ابو نے بھی اس دن کا ہمیشہ خاص خیال رکھا۔ اس روز صبح سویرے ناشتے کی میز پر وہ اسے ہیپی برتھ ڈے کہتے اور ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے۔ وہ بے تابی سے پیکٹ کھولتا۔ پیکٹ میں سے ہمیشہ کوئی ایسی چیز ملتی' جس کی اس نے کبھی خواہش کی ہوتی۔ پھر ابو کہتے۔ شام کو بازار چلیں گے۔ وہاں سے تم اپنی پسند کی کوئی چیز لے سکو گے۔ یہ ایک ریت بن گئی تھی۔ شام کو وہ ابو کے ساتھ بازار جاتا۔ رات کو گھر میں محدود سی پارٹی ہوتی جس میں ابو کے چند دوست اپنی فیملی کے ساتھ شریک ہوتے۔ شادی کے بعد فوزیہ نے بھی ہمیشہ اس دن کا خاص خیال رکھا۔ تب مہمان زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ صرف خاور اپنی بیوی کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ اور اب پچھلے دو سال سے تو بچے بھی اسے تحفے دے رہے تھے۔

یہ اس کی پہلی سالگرہ تھی کہ وہ سو کر اٹھا تو کسی نے اسے وِش نہیں کیا۔ پچھلی سالگرہ کا دن اسے خوب یاد تھا۔ چومے جانے کے احساس سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ فوزیہ کے ہونٹ اس کی پیشانی پر تھے۔ ایک رخسار پر سلیم کے اور دوسرے رخسار پر ملیحہ کے ہونٹ ثبت تھے اور جیسے ہی اس کی آنکھیں کھلیں' کورس شروع ہو گیا ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ڈیڈی اور فوزیہ کی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو عاصم بالکل الگ تھی۔

وہ چونکا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ اس نے بڑی بے رحمی سے اپنی آنکھیں ہتھیلیوں سے مسل ڈالیں۔ "میرے خدا میری ہر خطا معاف کر دے۔ میرے آقا مجھے بخش دے۔ آج کے دن کی تنہائی تو میرے لیے بہت بڑی سزا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

اسے بابر کا خیال آیا۔ یہ بھی ضروری تھا۔ بابر اسے ہمیشہ یاد رہتا تھا۔ لیکن سالگرہ

کے دن وہ اسے خاص طور پر یاد آتا تھا۔ اس سے رشتہ ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ اس کی ۱۸ ویں سالگرہ کا تحفہ تھا۔

اسے بچپن سے ہی بھائی کی بڑی آرزو تھی۔ کہیں دو بھائیوں کو لڑتے کھیلتے دیکھتا تو اداس ہو کر گھر آتا اور امی کی گود میں سر رکھ کر کہتا "امی--- میرا کوئی بھائی کیوں نہیں ہے؟"

امی سرد آہ بھر کر کہتیں "خدا کی مرضی میں کس کا دخل ہے بیٹے؟"

"تو اللہ میاں کیا مجھے ایک بھائی نہیں دے سکتے؟" وہ معصومیت سے کہتا۔

"ایسی باتیں نہ کرو بیٹے۔ اللہ میاں سب کچھ کر سکتے ہیں۔ دعا کیا کرو۔"

وہ بڑا ہوتا گیا۔ بھائی سے محروم ہی رہا لیکن اس نے کبھی اس محرومی سے سمجھوتا نہیں کیا۔ اس کی آرزو بھی اس کی عمر کے ساتھ بڑھتی رہی۔ البتہ اس نے اب امی یا کسی اور کے سامنے اس خواہش کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیا۔ امی اور ابو یہی سمجھے کہ اس نے اس محرومی کو قبول کر لیا ہے۔

اسے امی کی موت خوب یاد تھی۔ وہ اس وقت بارہ سال کا تھا۔ وہ ان دنوں بہت خوش تھا۔ ناسمجھی اور سمجھ داری کے درمیان معلق لڑکا اتنا جانتا تھا کہ اس کی دعا قبول ہونے والی ہے۔ اس کے گھر ایک چھوٹا بھائی آنے والا ہے۔ وہ ہر روز آنے والے اس بھائی کے لیے نت نئے منصوبے بناتا۔ اسے امی سے شرم آنے لگی تھی لیکن وہ امی سے بہت خوش بھی تھا۔

لیکن پھر اس کی خوشیاں چھن گئیں۔ سب خواب بکھر گئے۔ امی اس کے لیے بھائی کو جنم دینے کے دوران ہی اللہ میاں کے پاس چلی گئیں اور پھر ننھا بھائی بھی چند گھنٹے بعد امی کے پاس چلا گیا۔

وہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ لیکن اس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا۔ شاید اس لیے کہ وہ سمجھدار تھا۔ اور اس سانحے نے اسے اور سمجھدار بنا دیا تھا۔ اس نے غم بہت کیا لیکن

ظاہر بہت کم کیا۔ البتہ ماں اور اس بھائی کی موت جس کے لیے اس نے پل پل دعائیں کی تھیں، کی حقیقت کو قبول کرنے والے بارہ سالہ لڑکے نے بھائی کی آرزو سے دست بردار ہونا قبول نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی انسان کے پاس اللہ کی امانت ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے واپس لے لے۔ موت پر صرف اللہ کا اختیار ہے۔ اس میں شکایت کی کوئی بات نہیں۔ لیکن اتنی کم عمری میں بھی اس کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ دعائیں ضرور قبول فرماتے ہیں۔ اس کی طبیعت میں شکر اتنا تھا کہ وہ سوچتا۔ اللہ نے میری بھائی والی دعا بھی قبول فرمائی۔ مجھے بھائی دیا۔ چند گھنٹے کے لیے سہی مگر میری دعا بھی تو نامکمل تھی۔ میں نے بھائی تو مانگا تھا' اس کے لیے بڑی عمر تو نہیں مانگی تھی۔ سو وہ بھائی کی آرزو دل میں لیے لڑکپن سے گزر کر جوانی کی سرحد میں داخل ہو گیا۔

وہ اس کی ۱۸ ویں سالگرہ تھی۔ صبح ابو نے معمول کے مطابق اسے وش کیا اور ایک چھوٹا سا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ تمہارا تحفہ ہے بیٹے اور ہاں۔ آج شیڈول کچھ مختلف ہو گا۔ شام پانچ بجے دارالاطفال میں ایک تقریب ہے۔ مجھے اس میں شرکت کرنی ہے اس کے بعد بازار چلیں گے۔ پارٹی نو بجے ہو گی۔"

عاصم جانتا تھا کہ ابو ایسے کئی اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ کتنے ہی یتیم لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کے اخراجات بھی انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے "ابو' میں بھی تقریب میں چلوں گا آپ کے ساتھ۔" اس نے بے دھیانی سے کہا۔ اس کی انگلیاں پیکٹ کے کاغذ سے الجھی ہوئی تھیں۔ اس نے اوپر کا کاغذ کھولا اندر براؤن پیپر تھا۔ اس نے بے تابی سے براؤن پیپر کو پھاڑ ڈالا۔ وہ حیران رہ گیا' چھوٹا سا بے حد خوب صورت ایک مخملیں جیول باکس اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ انگوٹھی' کف لنکس' ٹائی پن' کیا ہو سکتا ہے۔

ابو اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ مسکرائے "کھول کر دیکھو نا۔"

اس نے دھڑکتے دل سے باکس کھولا۔ ایک لمحے کو اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول

گیا۔ خوب صورت مخملیں سیج پر ایک چابی رکھی تھی۔ چابی کے سر پر حروف چمک رہے تھے۔ "TOYOTA"

"باہر کھڑی ہے' چل کر دیکھ لو۔" ابو نے کہا۔

اس نے سر اٹھا کر ابو کو دیکھا لیکن ان کی محبت سے چھلکتی آنکھوں میں دیکھا نہیں گیا۔ اس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا "لیکن ابو میں اس کا اہل نہیں۔"

"تم آج ۱۸ سال کے ہو گئے ہو عاصم۔ اب تم بالغ ہو' اب میں تم سے امید کرتا ہوں کہ تم بڑے فیصلے بھی پورے اعتماد سے کرو گے۔"

"شکریہ ابو۔ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا اور میں ہمیشہ آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"ہاں' تم کہہ رہے تھے کہ میرے ساتھ تقریب میں شرکت کرو گے؟"

"جی ابو۔"

"تو چار بجے دفتر پہنچ جانا تیار ہو کر۔ وہیں سے چلے چلیں گے۔ تقریب کے بعد بازار چلیں گے۔ جہاں سے تم اپنی مرضی کی کوئی بھی چیز خرید سکو گے۔"

"ابو' کار کے بعد کم از کم آج مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ موقع ملے تو اس سے ضرور فائدہ اٹھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرنا کبھی نہ بھولو۔ او کے؟"

"او کے ابو۔"

"ہاں' دفتر اپنی کار میں آنا۔ اچھا چلو کار تو دیکھ لو اپنی۔"

دونوں باہر آئے جہاں نئی چم چماتی سلور گرے ٹویوٹا کرولا کھڑی تھی۔

ابو دفتر چلے گئے۔ وہ ناشتا کر کے اپنی گاڑی میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اسے کھانے کا بھی ہوش نہیں رہا۔ بھوک ہی نہیں لگی۔ اسے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں کہاں گاڑی دوڑاتا پھرا ہے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ سوا چار بجے ابو کے پاس پہنچ

گیا۔

دارالاطفال کی تقریب بے حد سادہ تھی۔ بچوں کو صاف ستھرے کپڑے پہنائے گئے تھے۔ تقریب کچھ بچوں کے ختم قرآن مجید کی اور کچھ بچوں کی بسم اللہ کی تقریب تھی۔ وسیم قریشی صاحب مہمان خصوصی تھے۔ تقریب کے بعد وہ فرداً فرداً بچوں سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ عاصم ان کے ساتھ تھا۔ وہ بھی بچوں سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ اچانک ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی نظر اس بچے سے ملی۔ وہ بڑی معصومیت سے سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ ان نگاہوں میں نہ جانے کیا تھا کہ عاصم بت بن کر رہ گیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ ابو آگے نکل گئے۔

اس بچے میں نہ جانے کیسی کشش تھی۔ وہ بے حد جانا پہچانا' بے حد اپنا اپنا محسوس ہو رہا تھا "تمہارا نام کیا ہے بیٹے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا نام بابر ہے انکل۔"

"انکل نہیں' مجھے بھائی جان کہو۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان۔"

اسی لمحے ابو نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ تمام بچوں سے ہاتھ ملا چکے تھے' "کیا بات ہے عاصم؟" انہوں نے اسے پکارا۔

"آیا ابو!" عاصم نے کہا پھر وہ بچے کی طرف مڑا "تم یہیں کھڑے رہنا بیٹے۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ابو کی طرف چلا گیا۔ ابو یتیم خانے کے منتظم سے بات کر رہے تھے۔

"ابو۔! ایکس کیوز می۔" اس نے کہا۔

"جی بیٹا؟" ابو اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"آپ کو مجھے ایک من پسند تحفہ دینا ہے نا آج؟"

"جی بیٹے' یہ تو طے شدہ بات ہے۔"

"تو میں وہ بچہ لینا چاہتا ہوں۔" عاصم نے بچے کی طرف اشارہ کیا "بابر ہے اس کا نام۔"

حیرت سے ابو کا منہ کھل گیا "بچہ؟ بابر؟"

"جی ہاں ابو' میرے لیے چھوٹا بھائی۔"

ابو کی آنکھوں میں پل بھر کو نمی سی چمکی لیکن پھر انہوں نے خود پر قابو پا لیا "رضوان صاحب' کیا یہ ممکن ہے؟" انہوں نے منتظم سے پوچھا۔

"کیوں نہیں جناب۔ یہ تو خوشی کی بات ہو گی ہمارے لیے اور بچے کی تو قسمت سنور جائے گی۔ کل آپ وکیل کو لے آیئے گا' قانونی کارروائی مکمل ہو جائے تو اسے لے جایئے گا۔"

"ٹھیک ہے رضوان صاحب۔"

"ابو۔" عاصم نے اچانک مداخلت کی "۳۰ دسمبر تو آج ہے نا' کل تو ۳۱ ہو جائے گی۔"

ابو اس کی بات سمجھ گئے "رضوان صاحب' ہم اس بچے کو ابھی نہیں لے جا سکتے؟" انہوں نے پوچھا۔

رضوان صاحب مسکرائے "کوئی بات نہیں سر۔ قانونی کارروائی ہو جائے گی۔ آپ بچے کو آج لے جائیں۔ ویسے عاصم میاں نے بہت پیارے بچے کا انتخاب کیا ہے۔ بہت نیک طبیعت اور محبت والا بچہ ہے یہ بابر۔ نہایت سلیم الطبع۔ آیئے میرے ساتھ۔"

ابو رضوان صاحب کے ساتھ بابر کی طرف بڑھ گئے۔ عاصم چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ لگتا تھا کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ پھر وہ بھی بابر کی طرف چل دیا۔ وہاں ابو رضوان صاحب سے کہہ رہے تھے "بچے سے تو پوچھ لیں رضوان صاحب۔"

"اس کی تو یہ خوش قسمتی........"

"پھر بھی" ابو کے لہجے میں تیزی تھی۔

"بابر۔ قریشی صاحب تمہیں اپنا بیٹا بنا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ جاؤ گے بیٹے؟" رضوان صاحب نے بابر سے پوچھا۔

بابر نے انکار میں سرہلا دیا "نہیں۔" اس کے لہجے میں عجیب سی معذرت تھی۔

قریب پہنچتے ہوئے عاصم نے دیکھا کہ ابو کا چہرہ ست گیا ہے "کیوں بیٹے؟" انہوں نے بے حد شفقت سے پوچھا "ہم تمہیں اچھے نہیں لگے؟"

"آپ بہت اچھے ہیں۔" بابر نے کہا پھر اس نے سر گھما کر اپنی طرف آتے ہوئے عاصم کو دیکھا اور بولا "میں ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ بھائی جان کے ساتھ۔"

ابو کے چہرے سے کشیدگی ڈھل گئی اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیئے "ٹھیک ہے بابر تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔"

رضوان صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے ابو سے کہا "آپ میرے ساتھ دفتر میں تشریف لے چلیں۔ اس کا برتھ سرٹیفکیٹ لے لیجئے گا۔ میں اس کے بارے میں بتا بھی دوں گا آپ کو۔" ابو رضوان صاحب کے ساتھ آفس کی طرف چل دیئے۔

"بابر۔ تم اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہہ دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ پھر گھر چلیں گے۔" عاصم نے بابر سے کہا اور خود بھی آفس کی طرف چل دیا۔

آفس میں رضوان صاحب ایک فائل کھولے بیٹھے تھے "یہ بچہ چھ سال کا ہونے والا ہے۔" وہ کہہ رہے تھے کہ عاصم بھی وہاں پہنچ گیا "اس کی ماں اس کی ولادت سے چھ ماہ پہلے بیوہ ہوئی تھی۔ یہ جناح اسپتال میں پیدا ہوا۔ ماں زچگی کے دوران مرگئی۔ یہ یہاں ایک دن کا آیا تھا۔ یہ ہے اس کا برتھ سرٹیفکیٹ۔" انہوں نے سرٹیفکیٹ عاصم کی طرف بڑھایا۔ عاصم نے سرٹیفکیٹ کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔ پھر اس نے سرٹیفکیٹ ابو کی طرف بڑھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ابو۔ اللہ میاں نے سچ مچ مجھے میرا بھائی دے دیا ہے۔"

ابو نے حیرت سے اسے دیکھا پھر سرٹیفکیٹ کو پڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "۲۴ اپریل ۶۷ء۔" انہوں نے دھیمی آواز میں کہا "بے شک بیٹے' یہ اللہ کی طرف سے تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔"

وہ تاریخ عاصم کیسے بھول سکتا تھا۔ اس دن اللہ نے امی کے ساتھ اس کے نومولود بھائی کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔

دفتر کے باہر ننھا بابر اس کا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا شاپنگ بیگ تھا۔ عاصم کو دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرایا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے بابر؟" عاصم نے پوچھا۔

"میرے کپڑے اور کتابیں ہیں بھائی جان۔"

"یہاں کی سب چیزیں اور تمام یادیں یہیں چھوڑ دو بابر۔ ابھی ہم تمہارے لیے نئے کپڑے اور کتابیں لیتے ہوئے گھر چلیں گے۔" عاصم نے کہا۔

یادیں وہیں چھوڑنا تو بابر کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا تاہم شاپنگ بیگ اس نے وہیں زمین پر رکھ دیا اور اس کی انگلی تھام کر بولا "چلیں بھائی جان۔"

انگلی پر ننھے منے ہاتھوں کی وہ گرفت ایک ایسی محبت کا احساس دلا رہی تھی جو عاصم کے لیے بالکل نئی تھی' جس کے لیے وہ ترستا رہا تھا۔ وہ بابر کو اپنی نئی گاڑی کی طرف لے گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر بابر سے کہا "بیٹھو بابر' یہ تمہاری اور میری کار ہے۔"

گلی میں کوئی گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ انجن نے بیک فائر کیا تو عاصم بری طرح چونکا۔ پھر نگاہوں کی دھندلاہٹ نے اسے پریشان کر دیا۔ یہ سمجھنے میں اسے کچھ دیر لگی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس بار اس نے دریا پر بند نہیں باندھا "میرے معبود' تو نے مجھ پر ہمیشہ کرم فرمایا۔ مجھے خوشیاں عطا فرمائیں۔ آج میں اکیلا ہوں۔ بچوں سے' بیوی سے دور تو ضرور مجھ سے کوئی بہت بڑی خطا ہوئی ہو گی۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "عاصم قریشی اسپیکنگ" اس نے

بے ساختہ کہا۔ اس وقت اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اب وہ مرشد حسین ہے۔

"ہیلو بھائی جان!" دوسری طرف سے چہکتی ہوئی آواز سنائی دی "میں آ گیا ہوں بھائی جان۔"

عاصم گنگ ہو کر رہ گیا۔ بڑی مشکل سے وہ بولا "بابر۔ بابر" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی "کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"ائرپورٹ سے لیکن زیادہ باتیں نہیں ہوں گی۔ آپ مجھے یہ بتائیں، میں کہاں پہنچوں؟"

"ٹیکسی کرو اور کیفے لبرٹی طارق روڈ پہنچ جاؤ۔ میں تمہیں منتظر ملوں گا۔"

"او کے بھائی جان۔ باقی باتیں ملاقات پر۔" رابطہ منقطع ہو گیا۔

رکے ہوئے آنسو پھر بہنے لگے۔ اس بار وہ شکر کے آنسو تھے۔ معبود نے پھر اس پر کرم فرمایا تھا۔ جنم دن پر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کی سالگرہ کا تحفہ امریکا سے آیا تھا۔

☆===========☆===========☆

اس بار فوزیہ ایک ٹوٹی پھوٹی ہستی لگ رہی تھی۔ متورم آنکھوں نے نجمی کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ وہ یقیناً روتی رہی تھی۔ نجمی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک پل کے لیے پھیکی پھیکی سی خیر مقدمی مسکراہٹ ابھری "آیئے نجمی صاحب" فوزیہ نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا "میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے لیے وقت نکالا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں فرصت سے بیٹھا تھا۔" نجمی نے کہا۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ثمینہ کافی کی ٹرے رکھنے کے بعد واپس جا رہی تھی۔ شاید فوزیہ نے ریسیور رکھتے ہی اسے کافی کے لیے کہہ دیا تھا۔ فوزیہ نے کافی بنائی اور پیالی اس کے سامنے کھسکا دی "آج میں بینک گئی تھی۔" اس نے کہا۔

"اپنا اکاؤنٹ چیک کرنے؟" نجمی نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

فوزیہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور کافی کی پیالی پر جھک گئی۔ "کوئی خاص بات؟"

فوزیہ نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نجمی حیران رہ گیا۔ پچھلی ملاقات میں وہ بہت مضبوط اعصاب کی ثابت ہوئی تھی۔ یقیناً کوئی بڑی بات ہو گی جس نے اسے طرح توڑ کر رکھ دیا ہو گا۔ لیکن کیا بات ہو سکتی ہے وہ فوزیہ کو بغور دیکھتا رہا جو پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔ "کچھ بتایئے تو۔" نجمی نے کہا۔

"انہوں نے میرے اکاؤنٹ میں دس کروڑ روپے جمع کرائے ہیں۔"

نجمی کو جھٹکا سا لگا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا "کب کی بات ہے؟"

"گھر سے جانے کے ٹھیک آٹھویں دن۔"

"نقد یا چیک کے ذریعے؟"

"بیکرا نویسٹرز انکارپوریٹڈ کا چیک تھا۔"

"تو آپ اتنی دل گرفتہ کیوں ہیں۔ یہ تو ایک مثبت علامت ہے، یعنی وہ زندہ ہیں۔"

فوزیہ نے سر اٹھا کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا "میرے نزدیک یہ سراسر منفی علامت ہے۔ اتنی بڑی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا مطلب ہے کہ خدا نخواستہ۔" وہ کہتے کہتے رک گئی "کاش ایسا نہ ہو لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے طور پر ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے اور بچوں کو اتنی دولت کا کیا کرنا۔ اس سے زیادہ تو ہمیں ان کی ضرورت ہے اور رہے گی۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

نجمی کو پشیمانی ہونے لگی۔ پیشہ ورانہ تقاضوں کے تحت وہ اس عورت پر شک کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ دنیا میں کتنی عورتیں ایسی ہوں گی جنہیں ان کا شوہر دس کروڑ روپے دے کر غائب ہو جائے اور وہ خوش ہونے کی بجائے شوہر کا غم کریں۔ یقیناً ایسی عورتیں کم ہی ہوں گی۔ اور جو ہوں گی وہ شوہر پرست ہوں گی۔ ان پر اس طرح کا شک کرنا بھی بدترین گناہ ہو گا۔

"اب یہ تو طے ہے بیگم قریشی کہ آپ کے شوہر اپنی مرضی سے، سوچے سمجھے منصوبے کے تحت روپوش ہوئے ہیں۔" اس نے کہا "آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"میں نے اس سلسلے میں بہت سوچا ہے لیکن مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔" فوزیہ کے لہجے میں بے بسی تھی "سچ کہہ رہی ہوں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

نجمی نے سوچا، ظاہر ہے یہ کیسے سمجھ سکتی ہے۔ اس نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور پیالی ختم کر کے رکھ دی "ایک بات بتائیں۔" اس نے کہا "آپ صرف اس بات پر تو اپ

سیٹ نہیں۔ کوئی اور بات بھی ہے۔ وہ کیا ہے؟"

فوزیہ اس سے نظریں چرانے لگی "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"پلیز مجھ سے نہ چھپائیں، میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

فوزیہ اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ آخر کار اس نے بتایا "دراصل آج عاصم کا برتھ ڈے ہے۔ مجھے یہ سوچنا بہت عجیب لگ رہا ہے کہ آج وہ اکیلے ہوں گے۔ کاش ایسا نہ ہو۔"

نجمی سمجھ گیا۔ اسے فوزیہ کو اداسی کے خول سے نکالنا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ ایسی کیفیت میں اشتعال بے حد موثر ثابت ہوتا ہے "تو آپ یہ کیوں سمجھ رہی ہیں کہ وہ اکیلے رہنے کے لیے آپ کو اور بچوں کو چھوڑ کر روپوش ہوئے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"آپ بہت سادہ لوح ہیں مسز قریشی۔ اگر کوئی شخص اپنے تمام اثاثے ۹۰ کروڑ میں فروخت کر کے ۱۰ کروڑ بیوی کو ٹکا دے تو یہ کوئی احسان تو نہیں۔ اور ۸۰ کروڑ روپے لے کر روپوش ہونے والا کسی کٹیا میں بیٹھ کر خود کو عبادت و ریاضت میں مصروف کرنے کے لیے تو روپوش نہیں ہوا ہو گا۔"

خلاف توقع فوزیہ مسکرا دی "آپ عاصم کو نہیں جانتے اس لیے ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ ورنہ میں عاصم کے متعلق اس قسم کی گفتگو برداشت نہیں کرتی۔"

"تو آپ کے خیال میں اس پورے قضیئے کی بنیاد میں کوئی عورت نہیں ہو گی؟"

"اگر مجھے اس مفروضے پر یقین آ سکتا ہوتا تو میں اس وقت پریشان نہ ہوتی نجمی صاحب۔ پھر تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی بہت ہی خطرناک بات ہو گی کہ وہ اس طرح چلے گئے اور میں اس کے بارے میں کوئی اندازہ تک نہیں قائم کر سکتی۔ یہی وجہ ہے میری پریشانی کی۔"

اب نجمی خود کو اس کی جگہ رکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کتنی پریشان ہو گی۔ اس

کے جی میں آئی کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا کر کم از کم اندیشوں کی قید سے تو آزادی دلا دے۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ اس کے لیے کوئی مناسب موقع نہیں۔ یہ اس کے شوہر کا جنم دن ہے۔ ”ایک ذاتی سوال پوچھوں آپ سے؟“

”ضرور پوچھیں۔ آخر میں ایک بے حد ذاتی معاملے میں آپ سے مدد لے رہی ہوں۔“

”بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟“

فوزیہ نے ایک سرد آہ بھری اور جیسے کچھ دیر خلاؤں میں گھورتی رہی۔ پھر بولی ”میں انہیں یہ نہیں بتا سکتی کہ ان کے پاپا انہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اتنے چھوٹے معصوم بچے۔ کیا گزرے گی ان پر۔ انہیں یہی معلوم ہے کہ عاصم امریکا گئے ہوئے ہیں۔“

”لیکن یہ اس مسئلے کا مستقل حل تو نہیں۔“

”جانتی ہوں۔ کل میں انہیں لے کر مری جا رہی ہوں۔ وہاں اسکول میں داخل کرا دوں گی۔ ثمینہ وہیں مری میں رہے گی۔ وہاں ہمارا ایک کالج ہے۔“

”آپ کی واپسی کب ہو گی؟“

”جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گی۔ پھر بھی ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔“ فوزیہ نے جواب دیا ”آپ عاصم کو تلاش کر رہے ہیں نا۔ کرتے رہیں گے نا؟“

نجمی نے سرد آہ بھر کے کہا ”میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ سچ یہ ہے کہ انٹر کان سے چیک آؤٹ کے بعد انہوں نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔ ایک ایسے آدمی کو تلاش کرنا جس نے خود کو چھپانے کے لیے اپنی ہر شناخت مٹا دی ہو، تقریباً ناممکن کام ہے۔ میں اس سلسلے میں کوشش کرتا رہوں گا لیکن میں زیادہ پرامید نہیں ہوں۔“

فوزیہ کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ تاہم اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا ”میں سمجھتی ہوں اور آپ کی شکر گزار بھی ہوں۔ مجھ سے آپ کسی بھی قسم کی مدد طلب کر سکتے ہیں۔ مری میں آپ مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔“ اس نے کاغذ پر ایک نمبر لکھ کر نجمی کی طرف

بڑھا دیا۔

اپنے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے نجمی سوچ رہا تھا کہ اب چند روز کی فرصت ہے۔ خاور ندیم بھی ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ فوزیہ مری جا رہی تھی اور عاصم کا کوئی سراغ فی الحال سامنے نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس عرصے میں ایڈز پر دو تین آرٹیکل ضرور لکھے گا۔ وقت آ گیا تھا کہ لوگوں کو ایڈز کے بارے میں بتایا جائے۔ حکومت کو اور محکمہ صحت کو احساس دلایا جائے کہ وہ اس معاملے میں صحیح خطوط پر کام نہیں کر رہے ہیں اور درست سمت میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ عام لوگوں کو یہ بھی بتانا تھا کہ انہیں ایڈز کے مریضوں سے نفرت کا کوئی حق نہیں۔ جو کیس عدالت میں ہوتا ہے اس پر اخبارات میں بھی رائے زنی نہیں کی جاتی کہ یہ توہین عدالت ہے تو پھر انسانوں کو کائنات کی سب سے بڑی عدالت میں زیر سماعت کسی کیس پر فیصلہ صادر کرنے کا کیا حق ہے!

☆============☆============☆

ٹیکسی کیفے لبرٹی کے سامنے رکی۔ بابر نے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ڈرائیور نے ڈکی کھول دی تھی۔ اس نے دو سوٹ کیس نکال کر رکھ دیئے ”یہ لیجئے سر آپ کا سامان۔“ بابر نے پرس کھول کر اسے دو سو روپے دیئے اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔ اچانک فٹ پاتھ پر کھڑا ایک شخص اس کی طرف بڑھا ”واپسی مبارک ہو بابر۔“

بابر نے اسے صورت سے نہیں آواز سے پہچانا۔ اس شخص کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی، بال بھورے تھے۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اسے اس میں بھائی جان کی شباہت نظر آنے لگی ”السلام علیکم۔ ارے بھائی جان، یہ کیا حلیہ بنا لیا ہے آپ نے۔“

عاصم نے سلام کا جواب دے کر اسے گرم جوشی سے لپٹا لیا۔ بابر بے تابانہ بھائی جان، بھائی جان کہتے ہوئے اس کے رخساروں اور گردن کو چومے جا رہا تھا۔ دونوں کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ایک مصروف فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں۔

پھر پہلے عاصم کو ہی ہوش آیا ”چلو، اب گھر چلیں۔“

بابر کی مزاحمت کے باوجود ایک سوٹ کیس عاصم نے اٹھالیا اس کی پناہ گاہ ویسے بھی زیادہ دور نہیں تھی۔ تین منٹ بعد وہ فلیٹ میں تھے۔

"اب تم نہا دھو کر کپڑے بدل لو پہلے۔" عاصم نے کہا "اپنے سوٹ کیس سے تولیہ بھی نکال لینا۔"

"تولیہ تو یہ کرسی پر بھی پڑا ہے۔" بابر نے اشارہ کیا۔

"یار بہت میلا اور بدبودار ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان۔" بابر نے کہا اور اپنے سوٹ کیس پر جھک گیا۔ کپڑے اور تولیہ لینے کے بعد وہ باتھ روم میں جا گھسا۔ نہا دھو کر نکلا تو وہ فریش ہو چکا تھا "بھائی جان' میں شیو بنوا کر ابھی آیا۔ پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"شیو؟ یہ کیا حماقت ہے۔ شیو ہمیشہ گھر میں بنایا کرو' سمجھے؟" عاصم نے سخت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی جان۔ آئندہ ایسا ہی ہو گا لیکن آج معاف کر دیں۔ میرے پاس شیونگ کٹ نہیں ہے۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں تم شیو باہر نہیں بنواؤ گے۔"

"تو پھر؟ آپ تو شیو سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔" بابر کے لہجے میں شگفتگی تھی "اب کیا کروں؟"

"شیو بنوانے جا رہے تھے' اب شیو کرنے کا سامان لے آؤ۔" عاصم نے نرم لہجے میں کہا۔ پھر اس نے جیب سے ہزار کے چند نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے "دو ایک شلوار سوٹ بھی خرید لینا اپنے لیے۔"

"رقم تو میرے پاس بھی ہے بھائی جان۔ لیکن آپ کے ہاتھ سے پیسے لیے اتنے دن ہو گئے ہیں اس لیے انکار نہیں کروں گا۔"

بابر کے جانے کے بعد عاصم بیڈ پر دراز ہو گیا۔ بابر کے آنے سے وہ بڑی تقویت

محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ بالکل اکیلا نہیں تھا۔

بابر کوئی دو گھنٹے بعد واپس آیا تو لدا پھندا تھا۔ اس نے شاپنگ بیگ بیڈ پر ڈھیر کر دیئے اور دو شاپنگ بیگ لے کر کچن کی طرف چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ ایک کیک' چھری اور ایک لفافہ ٹرے پر رکھ کر لایا اور ٹرے چھوٹی ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دی۔

عاصم چونک کر اٹھ بیٹھا "یہ کیا؟"

"بنیئے مت۔ آج آپ کی سالگرہ ہے۔"

عاصم اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے روکنے کے لیے پلکیں جھپکانے لگا "تمہیں یاد تھی؟"

"کب یاد نہیں ہوتی یہ تاریخ۔ بھائی جان' یہ آپ ہی کا نہیں میرا بھی تو جنم دن ہے۔" بابر نے کہا "آج یہاں پہنچنے کی خاطر تو میں نے وہ پہاڑ جیسے دن امریکا گزارے ہیں۔"

عاصم اس جملے کی معنویت کو سمجھ گیا لیکن خاموش رہا۔ بابر نے لفافے سے دو عددی موم بتیاں نکال کر کیک پر لگائیں پھر وہ اس سوٹ کیس کی طرف بڑھا جو اس نے ابھی کھولا بھی نہیں تھا۔ وہ سوٹ کیس کھول کر بابر نے چھوٹا سا ایک پیکٹ نکالا۔ پیکٹ بہت خوب صورت کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مبارکبادی کارڈ بھی منسلک تھا۔ بابر نے پیکٹ لے جا کر میز پر رکھ دیا "اب اٹھ بھی جایئے قبلہ۔"

عاصم اٹھا اور میز کی طرف چلا آیا۔ بابر نے موم بتیاں روشن کیں اور چھری عاصم کی طرف بڑھائی "بسم اللہ کیجیے بھائی جان۔"

عاصم کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ بابر کی محبت کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جھک کر پھونک ماری اور موم بتیاں بجھا دیں۔ اس نے کیک کاٹا۔ بابر کی تنہا آواز اسے وش کر رہی تھی۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو بھائی جان۔ پھر اس نے عاصم سے چھری لے کر کیک کا ایک پیس کاٹا اور اسے انگلیوں میں تھام کر عاصم کی طرف

مڑا "منہ کھولیے بھائی جان۔"

"ایسے نہیں چھری مجھے دو۔"

عاصم نے بابر سے چھری لے کر ایک اور پیس کاٹا "اب تم بھی منہ کھولو۔"

دونوں نے ایک دوسرے کے منہ میں کیک کا ٹکڑا ٹھونس دیا اور دونوں ہی ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ پھر بابر دوبارہ کچن کی طرف چلا گیا۔ اس بار وہ پلیٹیں لے کر آیا تھا "اب کیا ارادہ ہے بھائی؟" عاصم نے پوچھا۔

"بہت بھوک لگ رہی ہے بھائی جان۔ اب کھانا کھائیں گے۔" بابر نے کہا۔ پھر اس کی نظر تحفے کے پیکٹ پر پڑی "میں بھی بہت بدتمیز آدمی ہوں۔ بھوک لگے تو جانور بن جاتا ہوں۔ تحفہ دینا بھول ہی گیا آپ کو۔" اس نے پیکٹ اٹھا کر عاصم کی طرف بڑھایا "سالگرہ مبارک بھائی جان۔ اللہ آپ کو خوشیاں دے اور طویل عمر۔"

عاصم کے ہونٹوں پر بجھی بجھی مسکراہٹ ابھری۔ "شکریہ بھائی" اس نے کہا اور بے تابی سے کاغذ کو ہٹانے لگا۔ بابر پھر کچن میں چلا گیا تھا۔

کاغذ ہٹا تو گتے کا ایک پیکٹ نکلا۔ اس پیکٹ کو کھولا تو ایک چھوٹا سا جیول باکس نکلا۔ مخملیں جیول باکس۔ عاصم کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے اپنی اٹھارویں سالگرہ یاد آ گئی۔ وہی سالگرہ جس پر اللہ نے اسے بابر کا تحفہ دیا تھا۔ اس سالگرہ پر ابو نے اسے ایسا ہی ایک جیول باکس دیا تھا جس میں اس کی زندگی کی پہلی کار کی چابی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ یہ دن ہی یادوں اور آنسوؤں کا ہوتا ہے شاید۔

اس نے بچوں کے سے دھڑکتے دل کے ساتھ باکس کھولا۔ اندر ایک بے حد خوب صورت سنہری رسٹ واچ تھی۔

"کیسی لگی بھائی جان؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ بابر کھانا لگا چکا تھا۔ بروسٹ چکن، رائتہ، سلاد اور کلیجی اور اب وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

عاصم گھڑی کو ہاتھ میں لیے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا "بہت خوب صورت ہے۔" اس نے کہا۔

"خوب صورت تو ہے لیکن اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک چابی میرے دل کی بھی ہے۔ جب بھی کبھی بے یقینی میں گرفتار ہوں اس چابی کو کھینچیں اور میرے دل کی آواز سن لیں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

بابر نے قریب آ کر گھڑی کی سائیڈ میں لگی ایک چابی کی طرف اشارہ کیا "ذرا اسے باہر کی طرف کھینچیں۔"

عاصم نے چابی باہر کھینچی تو بابر کی آواز ابھری "آئی لو یو بھائی جان، آئی شیل آلویز لو یو۔ آئی لو یو۔" عاصم نے چابی دبا دی اور عجیب سی نظروں سے باہر کو دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں ایک سوال تھا۔ کیا یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی مجھ سے محبت کرتا رہے گا؟

"آیئے اب کھانا کھالیں۔"

کھانے کے بعد عاصم نے چائے بنائی۔ چائے کی پیالیاں سامنے رکھ کر وہ دونوں پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے "اب سناؤ تعلیم مکمل ہو گئی؟" عاصم نے پوچھا۔

"جی ہاں" بابر نے چائے کا ایک گھونٹ لیا "فارغ التحصیل ہو کر آیا ہوں۔ بہت سخت آٹھ سال گزارے ہیں آپ کے بغیر۔"

"کوئی محبت وحبت بھی کی کسی سے؟"

"اکیس سال پہلے کسی سے پہلی نظر کی محبت ہوئی تھی۔ تب سے اب تک کسی اور محبت کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

عاصم نے غور سے اسے دیکھا۔ نہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی نہ آنکھوں میں۔ وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"اب آپ سنائیں" بابر نے گہری سانس لے کر کہا اور چائے کی پیالی خالی کر دی۔

"سگریٹ!" عاصم نے سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ بابر ہچکچایا "یہ گستاخی تو نہیں ہو گی بھائی جان۔"

"پاگل۔ میں نے ہمیشہ تم سے یہی کہا تھا ناکہ ہم بھائی سے زیادہ اچھے دوست ہیں۔"

"یاد ہے بھائی جان۔" بابر نے سگریٹ لے لی۔ عاصم نے دیا سلائی جلا کر بڑھائی پھر اپنی سگریٹ بھی سلگا لی۔

"ہاں بھائی جان' آپ کے فون نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو میری ضرورت ہے۔ پھر آپ نے یہ فون نمبر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ گھر کا فون نمبر نہیں ہے اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ آپ کسی بہت بڑی پریشانی میں گرفتار ہیں۔ آپ بھابی اور بچوں سے دور اس فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔ کیوں؟ اور آپ کی صحت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"

"ہاں' میں اتنی بڑی مصیبت میں ہوں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔" عاصم نے آہستہ سے کہا "تمہیں مدد کے لیے بلایا مگر اب سوچتا ہوں کہ اپنے ساتھ تمہیں بھی مصیبت میں کیوں پھنساؤں۔"

"کیا بات کر رہے ہیں بھائی جان؟ میں تو بس آپ ہی کا دوسرا روپ ہوں' آپ کا سایہ۔"

"مگر اب میں بہت بڑا مجرم ہوں۔ ایک ایسا شخص جس سے کوئی بھی تعلق رکھنا پسند نہیں کرے گا۔"

"میں تو جو کچھ ہوں اور رہوں گا' میرا حوالہ آپ ہی ہوں گے اور میں اس پر فخر کروں گا ہمیشہ۔" بابر نے کہا۔

"مجھے تم سے جو مدد درکار ہے وہ مجرمانہ بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں آپ کے ایک اشارے پر جہنم بھی جا سکتا ہوں۔"

"صورت حال کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگا لو کہ اب میں عاصم قریشی نہیں ہوں۔ میرا نام' میری شخصیت بدل چکی ہے۔ سوائے تمہارے کسی کو نہیں معلوم کہ میں یہاں ہوں۔"

بابر مسکرایا "یہ تو میرے لیے فخر کی بات ہے۔ آپ دنیا میں سب سے زیادہ اعتماد مجھ پر کرتے ہیں۔"

"ہاں بھائی' یہ تو ہے۔" عاصم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بس پھر سب کچھ بتا دیجئے مجھے۔"

"اس وقت نہیں' فی الوقت تو سکون سے سو جاؤ۔ تازہ دم ہو کر اٹھو گے تو بات کریں گے۔ اس وقت تو مجھے بھی نیند کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

بابر نے بحث نہیں کی۔ اس نے کہا "ٹھیک ہے بھائی جان۔ یہ مناسب ہے۔ جلدی کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس وقت کی کمی نہیں۔"

اس رات عاصم کو نیند کے لیے دوا لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

☆===========☆===========☆

نجمی کو خاور ندیم سے ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ پہنچا۔ اس نے اس کی سیکرٹری کو اپنا نام بتایا۔ سیکرٹری نے انٹرکام پر خاور سے بات کی اور پھر بولی "آپ تشریف لے جائیے جناب۔ صاحب آپ کے منتظر ہیں"۔

اس ملاقات کا بندوبست فوزیہ نے کیا تھا۔ اس نے نجمی کو یقین دلایا تھا کہ خاور اس کے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔

خاور نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ "تشریف رکھئے مسٹر نجمی۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

نجمی صوفے پر بیٹھ گیا۔ خاور اٹھا اور خود بھی سامنے والے صوفے پر آ بیٹھا "آپ

مصروف تو نہیں ہیں۔" نجمی نے اس سے پوچھا "میری گفتگو طویل بھی ہو سکتی ہے۔"

خاور ندیم مسکرایا "اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اسی لیے آپ کو چھٹی کے بعد کا وقت دیا ہے۔"

"شکریہ" نجمی بھی مسکرایا۔ خاور خوش اخلاق آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ ابھی وہ گفتگو شروع نہیں کر پائے تھے کہ سیکرٹری چائے لے آئی۔ چائے بنا کر اس نے پیالیاں ان دونوں کے سامنے رکھیں اور واپس جانے لگی۔ خاور نے اسے پکارا "مس ناہید' آپ اب چھٹی کر سکتی ہیں۔ بنارس موجود رہے گا۔"

"بہتر سر۔"

اس کے جانے کے بعد خاور نجمی کی طرف متوجہ ہوا "اب فرمائیے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں قریشی صاحب کی گمشدگی کے کیس پر کام کر رہا ہوں؟"

خاور نے سر کو تفہیمی جنبش دی "فوزیہ نے مجھے بتا دیا تھا۔"

"میں قریشی صاحب کی شخصیت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ آپ ان کے سب سے اچھے دوست ہیں؟"

"واحد دوست کہئے۔ میرے دوست بے شمار ہیں لیکن میں عاصم کا واحد دوست ہوں۔"

"آپ انہیں کب سے جانتے ہیں؟"

"ہمارا ساتھ تو بچپن سے ہے۔ ہم قریب رہے' ساتھ پڑھے اور پھر ایک ہی فیلڈ میں گئے۔ یعنی آبائی بزنس۔" خاور نے جواب دیا۔

"آپ قریشی صاحب کے واحد دوست ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آدم بیزار......"

"نہیں" خاور نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "عاصم کے بھی ملنے والے بہت ہیں لیکن وہ خوش اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ طبع بھی ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔ بس' کئی اعتبار سے وہ مختلف آدمی ہے۔"

"ان کی گمشدگی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پولیس بھی ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی ہے۔"

"لیکن پولیس قریشی صاحب کے متعلق اتنا نہیں جانتی' جتنا آپ جانتے ہیں۔" نجمی نے کہا "میں اس سلسلے میں آپ کا نظریہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"سچ پوچھیں تو میں اس سلسلے میں کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکا ہوں۔ اس کی وجہ وہ ہے' جسے آپ پولیس پر میری فوقیت قرار دے رہے ہیں۔ یہ کہ عاصم کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اسے۔ وہ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو اب تک اس کی گمشدگی کے سلسلے میں میرے پاس کئی نظریے ہوتے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ وضاحت کریں گے آپ؟"

"عام آدمی کے بارے میں ہم کہہ سکتے تھے کہ کوئی لڑکی کا' عشق کا چکر ہو گا یا یہ کہ اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسی کوئی بات عاصم کے ساتھ نہیں ہو سکتی اور یہ خیال آتے ہی میں خود کو اندھیرے میں محسوس کرتا ہوں۔ مجھے سجھائی نہیں دیتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔"

"میں نے ایسے بہت لوگ دیکھے ہیں' جو پارسا مشہور تھے' عورتوں کی قربت سے گھبراتے تھے۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ ایسے ہی لوگ عورتوں کے معاملے میں کچھ بھی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ جنونی بھی ہوتے ہیں۔ ان سے کسی بھی اقدام کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ چھپے رستم کہا جاتا ہے ایسے لوگوں کو۔"

"عاصم ایسا نہیں ہے۔ میں اسے واقعی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو اپنے گرد و پیش کو بھی درست دیکھنا چاہتا ہے۔ میری محفلوں میں شرکت تو دور کی بات ہے' وہ تو جب بھی ملتا ہے مجھے لیکچر پلاتا رہتا ہے۔ اس کے اختیار میں ہو تو وہ پورے معاشرے کو

سدھار کر رکھ دے۔"

"گھرے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔" نجمی نے رائے زنی کی۔

خاور مسکرایا "تم یقیناً اچھے صحافی ہو۔ مجھے اکسا رہے ہو؟ لیکن میں تمہیں وہی کچھ بتاؤں گا' جو میں جانتا ہوں' جس پر یقین ہے مجھے اور یقین کرو میں خود آسانی سے کسی کی اچھائی پر یقین کرنے والا آدمی نہیں۔ میں تو بہت عیب جو ہوں۔ انسانوں میں صرف خامیاں ہی تلاش کرتا ہوں۔"

نجمی بھی مسکرایا۔ اسے یقین تھا کہ خاور ایسا ہی ہے "پھر بھی خاور صاحب' میں عاصم صاحب کی تلاش میں نکلا ہوں اور سب سے مضبوط امکان یہی ہے۔"

خاور نے ایک سرد آہ بھر کے پوچھا "تم اس کے گھر گئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"ثمینہ کو دیکھا ہے؟"

"دیکھا ہے۔"

"تب بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر میری چار بیویاں ہوتیں اور مجھے ثمینہ جیسی کوئی لڑکی نظر آ جاتی تو میں اس سے ہر قیمت پر شادی کرتا اور اگر میں فوزیہ کی جگہ ہوتا تو اتنی حسین لڑکی کو گورنس رکھنا تو کیا گھر سے ایک میل تک پھٹکنے نہ دیتا۔"

نجمی کو ہنسی آ گئی "میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے میں ان کی سیکرٹری رعنا سے بھی مل چکا ہوں۔"

"پھر بھی اپنے نظریے پر ڈٹے ہوئے ہو!"

"میرے پاس فی الحال کوئی نظریہ نہیں۔ میں تو کوئی نظریہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"بہرحال' یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی عورت کے چکر میں گیا ہو۔"

"انہوں نے تمام اثاثے فروخت کر دیئے۔"

"یہ ارادہ تو اس کا تقریباً ایک سال سے تھا۔ یہ تو جو کچھ بھی ہوا ہے اچانک ہی ہوا ہے کیونکہ وہ تو اپنے پروگرام پر عمل بھی نہیں کر سکا۔"

"کیسا پروگرام؟"

"فوزیہ نے نہیں بتایا تمہیں؟" خاور نے حیرت سے اسے دیکھا "وہ بیوی بچوں کے ساتھ امریکا میں مقیم ہونا چاہتا تھا۔"

"جہاں تک مجھے علم ہے' وہ پاکستان سے عشق کرنے والوں میں سے ہیں۔ ایسا آدمی ہمیشہ کے لیے ملک چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟" نجمی نے اعتراض اٹھایا۔

"عاصم آئیڈیلسٹ آدمی ہے۔ یہاں کے حالات نے اسے مایوس کر دیا ہے۔ اس کی اپنی منطق ہے کہ پاکستان میں اب سب کچھ امریکا کے حکم سے ہوتا ہے تو وہ وہاں کیوں نہ جا رہے' جہاں سے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ آزادی تو اب وہاں ہے۔ یہاں تو آزادی کے نام پر بدترین غلامی ہے۔"

"تب تو انہیں فائٹ کرنی چاہیے۔ آزادی کے لیے' جمہوریت کے لیے۔"

خاور سنبھل کر بیٹھ گیا "آپ مان لیں کہ جمہوریت کا الاپ بھی امریکا ہی کا ہے۔ اب جو کچھ میں کہوں گا' وہ عاصم کے نظریات ہیں۔ میں ان میں سے بیشتر سے متفق ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ریفرنڈم کرایا جائے تو پتا چلے گا کہ بھاری اکثریت ان سے متفق ہو گی۔ دیکھیں' اسلامی جمہوریت کی مثالیں کم سہی لیکن ایسی ہیں کہ قیامت تک روشن رہیں گی۔ وہاں خلیفہ وقت سے کوئی عام آدمی بھی جواب طلب کر سکتا تھا کہ اس کے پاس یہ چادر کہاں سے آئی جو وہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اور خلیفہ وقت عاجزی سے سب لوگوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا تھا۔ اور یہ جو مغربی جمہوریت ہے' اس میں تو ہر انسان کی رائے برابر ہے۔ حالانکہ عقل و فہم اور شعور میں کوئی دو انسان برابر نہیں ہوتے۔"

"اس بات سے تو میں بھی متفق ہوں۔" نجمی بولا "لیکن اب تو مغربی جمہوریت ہی

چلے گی۔ بہرحال جمہوریت آمریت سے تو بہتر ہے۔"

"یہ تو ایک فیشن والا نعرہ ہے۔ ذرا حقیقت پسند بن کر تو سوچیں کہ کس دور نے کیا دیا۔ ایوب خان کے دس برسوں نے پاکستان کو معاشی ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس عرصے میں ملک کو پہلی بار زراعت کے مرکز سے ہٹا کر صنعت کے راستے پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت چلایا گیا۔ ملکی معیشت کو ایسی مضبوط بنیاد فراہم کی گئی جس کی وجہ سے ہم آج اس سے برے حال میں نہیں۔ پھر منتخب جمہوری حکومتیں آئیں۔ ذرا حساب تو لگائیں کہ انہوں نے ملک و قوم کو کیا دیا۔ انہوں نے تو مضبوط صنعتی بنیاد میں اپنے مفادات کی خاطر نقب لگائی۔ اور سیاسی کلچر جو بنا وہ بھی سامنے ہے۔ اور اب ۸۸ء سے اب تک کی جمہوریت کا حساب بھی لگا لو۔ کرپشن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اقتدار سے محبت بھی کسی حد تک کی جا سکتی ہے اس کے حصول کے لیے اگر کوئی تمام جمہوری اصولوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دے تو کیا اسے کوئی سیاسی پارٹی چلانے کا حق ملنا چاہیے؟"

"بات یہ ہے کہ فوجی آمریت کی وجہ سے جمہوریت کی نشوونما ہمارے ہاں تعطل کا شکار ہوتی رہی۔ سیاستدانوں کی تربیت نہ ہو سکی۔"

"یہ بات سن سن کر بھی کان پک گئے ہیں اب تو۔ مجھے یہ بتائیں کہ کیا سیاست کوئی ٹیکنیکل شعبہ ہے۔ ارے ایک سیاست داں کے لیے صرف ایک اچھا مسلمان اور ملک و قوم سے محبت کرنے والا ہونا ہی کافی ہے اور اس کے لیے کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر میں تمہیں غلیظ گالیاں دینا شروع کر دوں تو تم کیا کہو گے۔ یہ کہ میری تربیت جمہوری ماحول میں نہیں ہوئی۔ یہ کوئی عذر ہے۔ سیاسی تربیت نہیں ہوئی تو کیا اچھا مسلمان بننے کی تربیت بھی نہیں ملی انہیں؟ اور اگر نہیں ملی تو قصور کس کا ہے؟ کسے کرنی چاہیے تھی یہ تربیت؟ میرے خیال میں تو آمریت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے آداب جمہوریت زیادہ بہتر طور پر سیکھے جا سکتے ہیں۔ ہمارے سیاست داں اسمبلی میں گالم گلوچ کرتے ہیں۔ بگڑے ہوئے بچوں کا سا بدتمیزی والا رویہ رکھتے ہیں۔ اس پر تم کچھ لکھ دو تو

چمچے صحافی میدان میں اتر آئیں گے۔ جیسے بدتمیز بچوں کے والدین ان کی صفائی پیش کرنے کھڑے ہوتے ہیں کہ فلاں کا بچہ تو اس سے زیادہ بدتمیز ہے۔ لکھیں گے کہ یورپ اور امریکا کے جمہوری ممالک میں اسمبلیوں میں اس سے زیادہ بدتمیزی ہوتی ہے۔ ایسی ایسی گالیاں دی جاتی ہیں کہ حد اور بس۔ اب ان سے پوچھا جائے کہ ان میں اور ہم میں کتنا فرق ہے۔ ہم مسلمان ہیں جنہیں خوش خلقی کی تاکید کی گئی ہے۔ ہم مغرب کی تقلید کیوں کریں اگر کرتے ہی ہو تو جمہوری رویوں کے معاملے میں بھی تو ایسا ہی کرو۔ وہاں ریل کا کوئی حادثہ ہو تو متعلقہ وزیر فوراً استعفیٰ دے دیتا ہے۔ ذرا سے اسکینڈل پر پورا کیریئر ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں کرپشن ثابت کیے جاؤ تو بھی لوگ اپنے عہدوں سے چپکے رہتے ہیں۔ اسمبلی میں، ٹی وی پر، اخبار نویسوں کے سامنے قسمیں کھا کر کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ بات ثابت ہو گئی تو استعفیٰ دے دیں گے۔ بات ثابت ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ ایک وزیر اپنا عہد پورا کرنے سے بچنے کے لیے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے اقتدار میں ہونے کے باوجود الیکشن میں دھاندلی ہوئی۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس صورت میں ان کی نااہلی ثابت ہو گئی اور استعفیٰ لازم ٹھہرا۔ یہ سب کیا ہے؟ کم سن نوجوانوں کا رویہ بھی اس سے زیادہ ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ تو پھر کیا ایسا ہے کہ ہم نے چھ سال کی عمر تک کے بچوں کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔ ملک کی باگ ڈور سونپ دی ہے۔ سات سال میں نے اس لیے نہیں کہا کہ سات سال کے بچے کو تو نماز پڑھوانا فرض ہو جاتا ہے۔"

نجمی اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے صحافی ہو کر بھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا "تو یہ عاصم قریشی کے خیالات ہیں؟"

"ہاں" خاور نے گہری سانس لے کر کہا "اور غلط نہیں ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ یہاں اقتدار کا مثلث بن گیا ہے۔ سب سے کمزور طاقت وہ ہے جس کے پیچھے عوامی قوت ہے، جسے سب سے زیادہ طاقت ور ہونا چاہیے۔ یہ جمہوریت ہے؟ ہاں، یہ وہ جمہوریت ہے جو امریکا کو ہمارے لیے پسند ہے۔ ہماری پچھلی حکومت دو تہائی اکثریت کے

باوجود ختم ہو گئی۔ دنیائے جمہوریت سے کوئی ایک ایسی مثال لادو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی لانگ مارچ کا نتیجہ نہیں تھا۔ احکامات اوپر سے آئے تھے۔ اب جو یہ حکومت مانگے کی سادہ اکثریت کے زور پر چل رہی ہے تو کیسے چل رہی ہے؟ میں بھی جانتا ہوں' تم بھی جانتے ہو اور پوری قوم جانتی ہے۔ ایسے میں آدمی بے بسی نہیں محسوس کرے گا' مایوس نہیں ہو گا کہ جمہوریت میں بھی اس کی مرضی نہیں چل رہی ہے؟ رائے اس کی لی جاتی ہے اور اس کے فیصلے کو توڑ مروڑ کر اس کے ہی خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ ان دیکھی طاقتیں کیا کیا کچھ کر دیتی ہیں اور ووٹ دینے والوں کو مطلع بھی نہیں کرتیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ سچ پوچھو تو اس نام نہاد جمہوریت سے تو آمریت ہی بہتر تھی۔ اس میں انسانوں کو استعمال کی چیزوں کی طرح برتا جاتا ہے۔ ان کا کام بس یہی ہے کہ جب حکم ہوا' ووٹ ڈال آئے۔"

نجمی نے سرد آہ بھر کے کہا "بات تو سچ ہے۔" وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "ممکن ہے قریشی صاحب امریکا چلے گئے ہوں۔"

"بیوی بچوں کو چھوڑ کر؟ ناممکن۔ تم نہیں جانتے وہ اپنے بچوں سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"میرے ذہن میں ہمیشہ اس سلسلے میں ایک ہی خیال آتا ہے۔ مگر کیونکہ عاصم مجھے بہت عزیز ہے اس لیے اسے رد کر دیتا ہوں۔" خاور نے کہا اور کچھ دیر سوچتا رہا "یہی ایک امکان رہ جاتا ہے کہ کسی گروہ کو بھنک مل گئی ہو کہ وہ اپنے تمام اثاثے فروخت کر رہا ہے اور انہوں نے اسے یرغمال بنا لیا ہو اور ممکن ہے۔ خدانخواستہ وہ اس دنیا میں نہ ہو۔"

"اس کے علاوہ کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی؟"

"میں نے کہا نا کہ میں عاصم کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی اور

صورت نظر نہیں آتی۔"

"لیکن مجھے اب تک جتنی معلومات ملی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے روپوش ہوئے ہیں۔"

"تو پھر اس کا دماغ چل گیا ہو گا۔ ورنہ روپوش ہونے کا کیا سوال ہے۔ وہ کوئی مجرم تو ہے نہیں۔"

"اور ان کے پاس ۸۰ کروڑ روپے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" خاور سوچ میں پڑ گیا "۸۰ کروڑ کوئی معمولی رقم نہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ وہ کوئی غیر قانونی کام کرے...... ۸۰ کروڑ کے ۸۰ ارب بنانے کے ارادے سے روپوش ہو گیا ہو اس لیے کہ دولت کی اسے کبھی کمی نہیں رہی لیکن اس نے دولت کو کبھی بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اگر اسے یرغمال نہیں بنایا گیا اور وہ اپنی مرضی سے روپوش ہوا ہے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کسی خاص مقصد کے لیے ایسا کیا ہو گا۔"

"کیا مقصد؟" نجمی سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"اس کے اپنے خیال میں وہ ملک و قوم کی خدمت ہو گی۔ خواہ میری تمہاری اور دوسروں کی نظر میں وہ جرم ہو۔ ممکن ہے وہ قوم کو متبادل قیادت فراہم کرنے کے چکر میں ہو اور اس سلسلے میں کسی احمقانہ اسکیم پر وقت اور پیسہ برباد کر رہا ہو کیونکہ یہاں کچھ بدل نہیں سکتا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ملک کے تمام لیڈروں اور سیاست دانوں سے متنفر ہو چکا ہے۔ اگر وہ متشددانہ ذہنیت کا مالک ہوتا تو شاید ان لوگوں کو قتل کرنے کے منصوبے بناتا اور ان پر عمل کرتا۔"

نجمی اٹھ کھڑا ہوا "شکریہ خاور صاحب' میں چلتا ہوں' ضرورت پڑی تو آپ کو پھر زحمت دوں گا۔"

"جب بھی ضرورت محسوس کرو مجھے فون کر لینا۔"

نجمی باہر نکل آیا۔ خاور ندیم کا آخری جملہ اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔

☆============☆============☆

"میں بس اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جرم مجھ پر ثابت ہو چکا ہے۔" عاصم بابر سے کہہ رہا تھا "لیکن میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ لہٰذا میرے پاس روپوشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"لیکن جرم کی نوعیت کے بارے میں تو بتائیے۔" بابر نے کہا۔

"سوری بھائی' اگر میں مجرم ہوں ہی نہیں تو پھر نوعیت سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس لیے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

بابر نے کندھے جھٹک دیئے "ٹھیک ہے بھائی جان۔ میرے لیے تو صرف آپ کی بات' آپ کا حکم کافی ہے۔ میرے لیے کچھ بھی جاننا ضروری نہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"کاروبار اور خدمت خلق۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں نے بتایا ناکہ میں اپنا کاروبار فروخت کر چکا ہوں۔ میرے پاس جو کچھ ہے' اس میں تمہارا حصہ بھی ہے۔ لہٰذا میں تمہاری شراکت میں ایک خاص کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں جدید طرز کی ایک لیب قائم کرنا چاہتا ہوں اور ممکن ہو تو ایک بلڈ بینک بھی۔ یہ تمہاری فیلڈ ہے۔ سرمایہ تم جتنا کہو گے مل جائے گا۔"

بابر چند لمحے سوچتا رہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اس لیب میں ایچ آئی وی اسکریننگ کا بندوبست بھی ہو اور ایڈز کے مریضوں کا مکمل ریکارڈ رکھا جائے۔"

"یہ تو ضروری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ پاکستان میں ایڈز سے نمٹنے اور اس کی روک تھام کے لیے اب تک سنجیدہ اقدامات نہیں کیے گئے ہیں۔"

"اسی پر کیا منحصر ہے۔ ہمارے ہاں پیسہ کمانے کے علاوہ کسی بھی سلسلے میں سنجیدہ اقدامات نہیں کیے گئے۔" عاصم نے سادگی سے کہا۔

"تو بھائی جان' یہ کام تو ہو جائے گا۔" بابر نے کہا۔ وہ ہچکچا رہا تھا "لیکن آپ نے کہا تھا کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہاں تم دنیا میں واحد آدمی ہو گے جس سے میرا رابطہ ہو گا۔ یہ میری مدد ہی تو ہے۔ ورنہ تو میرا دنیا سے' ہر اپنے سے اور اپنے ماضی سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے اور یہ تنہائی کیسی تنہائی ہے اس کا اندازہ تم کر سکتے ہو۔ پردیس میں آٹھ سال رہے ہو۔"

"یہ تو کوئی مدد نہ ہوئی۔" بابر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"تو کیا تم سمجھ رہے تھے کہ میں تمہیں کسی غیر قانونی کام میں ملوث کروں گا۔"

"خیر' آپ کی مرضی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے ایک اشارے پر سب کچھ کر سکتا ہوں۔" بابر نے کہا "اب پروگرام بتائیے۔"

پروگرام کا خاکہ عاصم پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے "جب بھی تم تیار ہو تو بتا دینا۔ میں اس کام کا آغاز لاہور سے کرنا چاہتا ہوں۔ ہم لاہور چل کر جگہ منتخب کریں گے پھر تمہیں آلات اور دیگر سازو سامان کی خریداری کے لیے بیرون ملک جانا ہو گا۔ وہاں سے آگے کا سب کام تمہارا۔"

"میں تو اس وقت بھی تیار ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کل ہم لاہور چل رہے ہیں۔"

☆============☆============☆

وحید نجمی بے حد پریشان تھا۔ خاور ندیم سے انٹرویو کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ عاصم قریشی کی روپوشی ایک نہایت سنگین مسئلہ ہے۔ وجہ یہ تھی کہ اب اسے عاصم قریشی کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے عاصم کو خود پر طاری کر کے خود کو اس کی جگہ رکھ کر سوچنے کی کوشش کی تھی۔ ایک محب وطن' آئیڈیلسٹ شخص

جس نے صاف ستھری زندگی گزاری ہو' جو اپنے وطن کے بددیانت' بدکردار اور غیر ملکی اشاروں پر ناچنے والے کٹھ پتلی لیڈروں سے متنفر ہو۔ جسے خدشہ ہو کہ اس کا ملک خدانخواستہ کسی بدیسی طاقت کا غلام بننے والا ہے' جس کے لیے آزاد سرزمین پر زندہ رہنا اتنا اہم ہو کہ وہ اس کے لیے اپنے وطن سے ہجرت کے لیے تیار ہو۔ جو کروڑ پتی بھی ہو اور ایسے شخص کو اچانک یہ پتا چلے کہ وہ ایڈز کا شکار ہو گیا ہے تو اس پر کیا گزرے گی؟ یہ طے ہے کہ وہ خود کو مظلوم سمجھے گا۔ اسے احساس ہو گا کہ معاشرے نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایسے شخص کے ذہن کے مسخ ہو جانے کا امکان بے حد قوی تھا اور مسخ ذہن کے لیے سب سے زیادہ اہم کون سا جذبہ ہو گا؟ یقینی طور پر نفرت۔ اور نفرت تو بے حد تند شکل میں اس ذہن میں پہلے سے موجود تھی۔ اب اس کا کیا حال ہو گا۔

اور ایڈز یقینی موت ہے۔ یقینی موت سے دو چار کوئی شخص اگر کوئی مقصد' کوئی نصب العین بھی رکھتا ہو تو وہ حد درجہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی ایک جاپانی شہری نے جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے مایہ ناز بحری جہاز کو تباہ کیا تھا۔ وہ اپنے طیارے کو لے کر جہاز کی چمنی میں کود گیا تھا۔

یعنی اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ عاصم قریشی ملک و قوم کو اپنی دانست میں سیاست دانون کے ناسوروں سے نجات دلانے کی کوشش کر سکتا ہے مگر کیسے؟ اس کے پاس دولت ہے۔ وہ اجرتی قاتلوں کو استعمال کر سکتا ہے۔ کوئی بڑی تخریب کاری کرا سکتا ہے۔ کوئی نئی سیاسی جماعت بنا سکتا ہے جس کے ذریعے متوسط طبقے سے قیادت ابھر کر آ سکے۔ اگرچہ یہ ایک طویل اور صبر آزما کام ہے۔ اچانک نجمی کو خیال آیا کہ عاصم کے پاس ایک طاقت اور بھی ہے۔ ایچ آئی وی' چلتی پھرتی موت۔ یہ خیال آتے ہی وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ سوال یہ تھا کہ عاصم اسے مخصوص لوگوں کے خلاف کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ایسی کون سی صورت ہو سکتی ہے۔

وہ اس پر غور کرتے کرتے تھک گیا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس نے تھک کر

فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں غور کرتا رہے گا لیکن اس سے زیادہ اہم مسئلہ عاصم کو تلاش کرنے کا ہے۔ اور یہ اب بہت ضروری ہو گیا تھا۔ عاصم کی روپوشی کسی وقت بھی دھماکا خیز ثابت ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اسے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ بے خبر فوزیہ قریشی کو حقیقت بتا دے۔ وہی اپنے شوہر کو اس کی کمین گاہ سے باہر لا سکتی ہے۔

☆===========☆===========☆

فوزیہ نے اب خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ صدمہ بہت بڑا تھا لیکن اس کے سامنے ایک اس سے بڑی پریشانی بھی تھی۔ دونوں بچے۔ ابھی اس نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن بچوں کے لیے باپ کی محبت بہت بڑی تھی۔ عاصم نے انہیں وقت بھی بہت دیا تھا۔ چنانچہ وہ دونوں عاصم سے بہت زیادہ قریب تھے۔ فوزیہ نے اس کا عارضی حل تو بہت اچھا تلاش کر لیا تھا۔ وہ انہیں مری کے کانونٹ اسکول میں داخل کرا آئی تھی۔ یوں اسے ایک سال کے لگ بھگ مہلت مل گئی تھی۔ اب وہ پرامید تھی کہ اس عرصے میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ ایک دبی دبی آس بھی تھی کہ شاید اس دوران عاصم واپس ہی آ جائے۔

اب وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر صرف عاصم کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ اس کا دل کہتا تھا کہ عاصم زندہ اور بخیریت ہے۔ پولیس نے گمشدگی کی رپورٹ درج ہونے کے بعد معمول کے مطابق ہر طرح کی کاروائی کی تھی۔ انہوں نے اسپتال چیک کیے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ عاصم کا اس کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔ یہ بات جہاں طمانیت بخش تھی وہیں قلبی اذیت کا باعث بھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ عاصم اسے اور بچوں کو چھوڑ گیا ہے۔ ایسے کہ اسے اعتماد میں لینے کی زحمت بھی نہیں کی۔ اسے کچھ بتایا تک نہیں' کیوں؟ بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ ان کے درمیان تو کبھی سخت کلامی تک نہیں ہوئی تھی۔ ازدواجی زندگی ہر اعتبار سے پرسکون اور خوش گوار تھی۔ پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اور وجہ کے بارے میں سوچتے سوچتے فوزیہ آخر کار عورت بن گئی اور عورت بننا اور زیادہ اذیت ناک تھا۔ جہاں مرد کے یوں چھوڑ جانے کی کوئی ظاہری وجہ نہ ہو' وہاں پھر ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے۔ دوسری عورت! عاصم ایسا نہیں تھا' کبھی نہیں رہا تھا لیکن پھر بھی مرد تو مرد ہی رہتا ہے نا۔ اس خیال نے اس کا سکون تباہ کر دیا۔ نیند اڑ گئی۔ وہ بے حد معقولیت کے ساتھ اس خیال کو رد کرتی' اسے ذہن سے جھٹکتی۔ لیکن پھر کسی وقت اچانک وہ پھانس کی طرح ذہن میں چبھنے' کھٹکنے لگتا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اس نے اپنے لیے ایک جہنم دہکا لیا ہے لیکن اس میں قصور عاصم کا بھی تھا۔ آخر ایسی کون سی بات ہو گئی تھی کہ وہ بغیر کچھ بتائے' بغیر کچھ کہے یوں چپکے سے اس کی زندگی سے نکل گیا۔ مگر اس کیفیت میں بھی اس نے ایک بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے لیے اسے مدد اور رہنمائی کی ضرورت تھی جو اسے وحید نجمی سے مل سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے نجمی کا نمبر ڈائل کیا دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔ اس نے چند منٹ کے وقفے سے دوبارہ رنگ کیا مگر بے سود۔ وہ گھر میں ہی نہیں تھا۔

وہ تیسری بار کوشش کر رہی تھی کہ انٹرکام کا بزر چیخا۔ اس نے فون رکھ کر انٹرکام اٹینڈ کیا "وحید نجمی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" سیکورٹی گیٹ سے بتایا گیا۔

"انہیں اوپر بھیج دو۔"

نجمی اوپر پہنچا تو وہ دروازہ کھولے کھڑی تھی "میں خاصی دیر سے آپ کا نمبر ملا رہی تھی۔" اس نے کہا۔

"میں گھر سے یہاں کے لیے نکل چکا ہوں گا۔" نجمی بولا۔

دونوں ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے "خاور بھائی سے مل لئے آپ؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"جی ہاں اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کو اندھیرے میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔"

فوزیہ سنبھل کر بیٹھ گئی "کیا آپ مجھ سے کچھ چھپاتے رہے ہیں؟"

"میں آپ کو اذیت نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔"

فوزیہ کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا "کچھ بھی معلوم نہ ہونے کی اذیت زیادہ بڑی ہوتی ہے۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کا فیصلہ تو اب آپ ہی کر لیجئے گا۔ میں اس وقت یہاں اس لیے آیا ہوں کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے' آپ کو بتا دوں۔"

فوزیہ اسے متوقع نظروں سے دیکھتی رہی۔ ذرا سے توقف کے بعد نجمی نے جو کچھ کہا' وہ اس حقیقت کے باوجود کہ فوزیہ نے خود کو بدترین خبر کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا' فوزیہ کے لیے ایک بہت بڑا دھماکا تھا "قریشی صاحب اس لیے روپوش ہوئے ہیں کہ ان کا ایچ آئی وی پازیٹو تھا۔ وہ ایڈز کے مریض ہیں۔"

فوزیہ تھوڑی دیر یوں بیٹھی رہی جیسے اس کے جسم میں جان نہ رہی ہو۔ پھر اس نے سرگوشی میں کہا "یہ ناممکن ہے۔"

"انہوں نے بھی معلوم ہونے پر یہی کہا تھا اور سچ یہ ہے کہ مجھے بھی یہ ناممکن لگتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔"

فوزیہ پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ جیسے سل گئے تھے۔

"مجھے یقین ہے کہ اب آپ کو ان بہت سے سوالوں کے جواب مل جائیں گے جنہوں نے آپ کو اب تک پریشان کر رکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے آپ کو یہ سچ بتا کر اچھا کیا یا برا۔ مگر اب اس سے فرق بھی کوئی نہیں پڑتا۔ بہرحال اب آپ کے سامنے ایک یقینی صورت حال ہے' کتنی ہی خوف ناک سہی۔"

فوزیہ بدستور خاموش تھی۔

نجمی اٹھ کھڑا ہوا "میں سمجھتا ہوں' آپ کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تنہائی کی ہے۔ آپ مجھے فون کر رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو مجھ سے کوئی بات کرنا تھی لیکن وہ بات بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے حاضر

ہوں۔ ضرورت کے ہر لمحے میں مجھے یاد رکھئے گا' خدا حافظ۔"

فوزیہ کے ہونٹ ہلے۔ شاید وہ اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی لیکن آواز نجمی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

☆===========☆===========☆

وہ کسی گہرے کنوئیں میں قید تھی' جہاں وقت کا کوئی گزر نہیں تھا۔ سوچوں کے بھنور بنتے بگڑتے اور وہ ان میں ڈوبتی ابھرتی رہتی۔ ابتدا میں تو غیر جذباتی انداز میں سوچنا ہی ناممکن تھا۔ بس ایک ہی خیال تھا اس کے ذہن میں۔ یہ ناممکن ہے۔ اس خیال میں بھی اس کے لیے ایک تسلی' ایک طمانیت تھی۔ وہ شک کے جہنم سے بری ہو گئی تھی اور نجمی کی بات کو غلط قرار دینا ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ سچ تھا کہ اس سچ نے اس کے سب سے مشکل سوال کا جواب دیا تھا۔ اب وہ جان گئی تھی کہ عاصم اتنی خاموشی سے اس کی اور بچوں کی زندگی سے کیوں نکل گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی اور چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اسے اور بچوں کو شرم سار نہیں کرانا چاہتا تھا۔ انہیں تماشا نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں گناہ گار پر اتنے پتھر نہیں برسائے جاتے جتنے اس بے گناہ پر برسائے جاتے ہیں جو دھوکے میں گناہ گار کی حیثیت سے پکڑا گیا ہو۔ ان جملوں کا تو مزہ ہی اور ہے' دیکھا سالے کو بڑا پارسا بنا پھرتا تھا۔ میاں ایسے لوگ زیادہ خراب ہوتے ہیں۔ عاصم خود کو بھی ان تیروں سے چھلنی نہیں کرانا چاہتا تھا اور اسے اور بچوں کو بھی ان سے بچانا چاہتا تھا۔ ایسے میں وہ اور کیا کرتا۔

وہ ہر بار یہاں تک سوچتی اور پھر اس کا ذہن۔ لیکن یہ ناممکن ہے کی تکرار کرنے لگتا۔ پھر نہ جانے کب ایسے ہی ایک موقعے پر وہ ایک ہی جست میں اس کنوئیں سے باہر آ گئی۔ اس نے چیخ کر کہا تھا "ناممکن کیسے ہے؟" اپنی آواز سے خود بھی اجنبی لگی تھی اور اس کنوئیں سے نکلتے ہی اس کے اندر ایک ملامت ابھری' کیا اس امر کو ناممکن کہتے ہوئے اس نے اس امر کے ممکن ہونے کو عاصم کی بے وفائی سے مشروط کر دیا تھا۔ وہ یقین سے

نہیں کہہ سکتی تھی کہ بات کیا تھی لیکن اب بہرحال وہ ہوش مندی اور حقیقت پسندی سے سوچ سکتی تھی۔ عاصم بہت اچھا شوہر' بہت اچھا باپ تھا اس کے کردار پر شک کرنے کی گنجائش.........

اچانک وہ بری طرح چونکی۔ ارے' یہ کیا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ کیوں؟ یہ سمجھنے میں اسے کچھ دیر لگی کہ رات ہو چکی ہے اور فلیٹ میں اندھیرا ہے۔ وہ اٹھی اور ٹٹول ٹٹول کر سوئچ بورڈ کی طرف گئی۔ روشنی ہوئی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

وہ پھر صوفے پر آ بیٹھی۔ یہ حقیقت تھی کہ عاصم کے کردار پر شک کرنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن وہ خود بھی یہ حماقت کر بیٹھی تھی تو پھر دوسرے کیا کریں گے۔ سچ ہے کہ انہیں موقع مل جائے تو وہ تو اسے چھلنی کر دیں۔ اس لحاظ سے عاصم نے درست فیصلہ کیا لیکن اس سے ایک غلطی ہو گئی۔ اسے اس کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔ یہاں پھر دل میں ٹیس اٹھی۔ اسے شاید مجھ پر اعتماد نہیں۔ پھر وہ پشیمان ہو گئی۔ اس کا پہلا رد عمل عاصم کے فیصلے کو درست ہی ثابت کر رہا تھا۔

اب اسے پہلی بار موقع ملا کہ وہ عاصم کے کرب کو محسوس کر سکے اور وہ لرز کر رہ گئی۔ وہ بے چارہ تو اپنے کندھوں پر اپنی صلیب اٹھائے پھر رہا تھا۔ کس قدر اکیلا ہو گا وہ؟ کہاں ہو گا۔ اور کیا کر رہا ہو گا؟ دیر تک وہ یہ سوچ سوچ کر کڑھتی اور آنسو بہاتی رہی۔ یہ جذباتی ریلا گزرا تو اسے اپنا فیصلہ یاد آیا۔ اسے یاد آیا کہ اس سلسلے میں اسے نجمی سے مدد لینا تھی۔ اب وہ فیصلہ اور زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ اسے کسی نہ کسی طور عاصم تک اپنی بات پہنچانا تھی اور اس کی سب سے اچھی اور یقینی صورت یہی تھی۔

اس نے سوچا نجمی سے اگلے روز بات کرے گی۔

☆===========☆===========☆

لیب کا مسئلہ توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔ عاصم کا ارادہ تھا کہ زمین خرید کر خود تعمیر کرائے گا۔ لیکن بابر کو اپنے مطلب کی ایک عمارت نظر آ گئی۔ عاصم کو بھی وہ پسند آ

گئی۔ چنانچہ اسے خرید لیا گیا۔ اتنا کیش عاصم کے پاس موجود تھا۔ لاہور پہنچتے ہی اس نے مرشد حسین کے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھول لیا تھا۔ اب اسے باقی رقم سوئزر لینڈ سے منتقل کرانا تھی۔ اکاؤنٹ بابر کا بھی کھل گیا تھا۔

لیب کے لیے مشینری درآمد کے سلسلے میں ڈیوٹی سے استثنا لینا تھا۔ بابر کو دو ہفتے اسلام آباد میں دھکے کھانا پڑے۔ اس دوران عاصم نے اپنے لیے لاہور میں مکان کا بندوبست کر لیا۔ وہ علامہ اقبال ٹاؤن میں چھوٹا سا تین کمروں کا مکان تھا جو اس کے لیے بہت کافی تھا۔ مشینری کی درآمد کی اجازت ملتے ہی بابر نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ اسے سوئزر لینڈ اور پھر جرمنی جانا تھا۔ اندازاً ایک ہفتہ اس میں بھی لگ جاتا۔ بابر نے اس پر بہت شور مچایا کہ عاصم نے اپنی رہائش کا بندوبست الگ کر لیا ہے۔

"یہی بہتر ہے۔" عاصم نے کہا "میں کہہ چکا ہوں کہ میں تمہیں اپنے معاملات میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے بھی لیب کی بلڈنگ میں تمہاری رہائش مجھے پسند نہیں آئی۔ اب تو تمہیں گھر بسانے کا سوچنا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد اپنے لیے کوئی اچھا سا بنگلا ڈھونڈو۔"

"جب میرا گھر بسایئے گا تو خود ہی ڈھونڈ لیجیے گا۔" بابر نے کہا "ویسے آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ میں بھابی اور بچوں سے ملنے کو تڑپ رہا ہوں۔"

"مل لینا' پہلے کام مکمل کر لو۔"

تین دن بعد بابر یورپ روانہ ہو گیا۔

اب عاصم کو اپنے اصل منصوبے پر کام کرنا تھا۔ پیسے کی تو ہر جگہ اہمیت ہے لیکن فلمی دنیا میں تو اس کی حیثیت ایک دیوتا کی سی ہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اسے ملک اسٹوڈیو میں دفتر مل گیا۔ پہلے ہی دن سے امداد پروڈکشنز کے دفتر میں بھیڑ لگ گئی۔ مزید ایک ہفتے میں پورے اسٹوڈیو کو معلوم ہو گیا کہ مرشد حسین بہت تگڑی اسامی ہے۔ دفتر میں ان ہدایت کاروں کی قطار لگ گئی جن کا کام یہی تھا کہ تگڑی پارٹی پھانسیں اور فلم

بنانے کے نام پر سال دو سال کا خرچا نکال لیں۔ ان کے کریڈٹ پر آج تک کوئی فلم نہیں تھی۔

عاصم اس دنیا کو اسٹڈی کر رہا تھا۔ اسے کسی مناسب آدمی کی تلاش تھی۔ اس دوران وہ اس ماحول کو بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ وہ زندگی سے قریب ہو گیا تھا۔ فلم میکنگ اس کا پرانا شوق تھا۔ اب قدرت نے اسے اس شوق کی تکمیل کا موقع دے دیا تھا۔

☆============☆============☆

نجمی کو یقین تھا کہ فوزیہ کو سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ شاک بہت بڑا تھا۔ لیکن کوئی شاک بھی آدمی سے بڑا نہیں ہوتا۔ آخر کار آدمی سنبھل جاتا ہے۔ فوزیہ بھی سنبھل جائے گی۔ البتہ یہ ضروری نہیں تھا کہ اب وہ اس سے رابطہ کرے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اب کبھی اس کا سامنا ہی نہ کرے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "وحید نجمی اسپیکنگ۔"

"میں فوزیہ بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے جانی پہچانی آواز آئی اور نجمی سناٹے میں رہ گیا "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے نجمی صاحب۔"

"جی' میں حاضر ہوں۔ فرمایئے" نجمی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے فلیٹ پر آ سکتے ہیں؟"

"جی' حاضر ہو جاؤں گا۔"

"تو پھر آ جایئے۔ بات تفصیل طلب ہے۔"

"میں آ رہا ہوں۔"

اس بار گیٹ پر موجود گارڈ نے نہ اس کا شناختی کارڈ چیک کیا' نہ ہی انٹرکام پر فوزیہ سے رابطہ کیا "ہیلو مسٹر نجمی فرام ڈیلی سویرا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے لیے گیٹ کھول دیا۔ نجمی کو حیرت تو ہوئی مگر اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ گارڈ کا شکریہ ادا

کرتے ہوئے وہ اپنی موٹر سائیکل اندر لے گیا۔

اوپر، فوزیہ نے دروازہ کھولا اور بولی "آئیے، آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔ بنا چکی ہوں۔"

"تو ثمینہ۔؟"

"وہ اب مری میں ہے۔"

فوزیہ اندر چلی گئی اور ذرا دیر بعد چائے کی ٹرے لے آئی۔ چائے کی ایک پیالی اس نے نجمی کی طرف بڑھائی۔ دوسری پیالی اپنے سامنے رکھ لی۔

"بیگم صاحبہ، آپ آہنی اعصاب کی مالک ہیں۔" نجمی نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"اعصاب کسی کے آہنی نہیں ہوتے۔" فوزیہ نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کچی مٹی کے جسم پر کبھی اسٹیل کی پتری چڑھ جاتی ہے۔ اندر کی مٹی تو چٹختی بھی ہے اور جھڑتی بھی ہے۔ لیکن نظر کسی کو نہیں آتا۔"

"پھر بھی آپ بہت مضبوط ثابت ہوئی ہیں۔"

"پہلے مضبوطی بچوں کی وجہ سے تھی۔ اب اس دکھ کی وجہ سے ہے کہ اس وقت انہیں میری شدید ضرورت ہے۔ کیا گزر رہی ہو گی ان پر۔ ان کے دکھ کے سامنے میرے دکھ کی کیا حیثیت ہے۔ اور اب تو میرے پاس اس یقین کی مضبوطی بھی ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں خیریت سے ہے۔ اور میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت اسی بات کی ہے۔"

"قریشی صاحب بہت خوش نصیب ہیں۔"

فوزیہ نے تیزی سے بات کا رخ بدلا "نجمی صاحب، میں اپنے شوہر تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہوں کہ وہ یا تو گھر آ جائیں یا مجھے اپنے پاس بلالیں۔ کیونکہ اس وقت صرف میں ہی ان کے کام آ سکتی ہوں۔ مجھے ان سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

نجمی ہکا بکا رہ گیا "بیگم صاحبہ، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں ہیں تو میں یہ بات سب سے پہلے آپ کو بتاتا۔ آپ غلط سمجھ......"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" فوزیہ نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن میرا ان سے رابطہ ضروری ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ ہمیں جب علم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں تو......"

"میری سمجھ میں ایک طریقہ آگیا ہے۔ اس سے یہ کام یقینی طور پر ہو سکتا ہے۔"

ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود نجمی کی سمجھ میں کوئی ایسا طریقہ نہ آسکا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا "معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ، میں بالکل نہیں سمجھ سکا ہوں۔"

"اس پر عمل کرنے کے لیے مجھے آپ کا ٹیکنیکل تعاون درکار ہو گا۔"

"میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ لیکن پہلے مجھے سمجھائیں تو۔"

"اس مقصد کے لیے مجھے ایک اخبار کی اشاعت کا اہتمام کرنا ہو گا۔"

"اخبار؟" نجمی حیران رہ گیا "اس سے آپ کا مقصد کیسے حاصل ہو گا؟"

"ہم اخبار کی پبلسٹی کرتے ہوئے فوزیہ قریشی کی زیر ادارت پر خاص طور پر زور دیں گے۔ یوں عاصم ہمارا اخبار لینے پر مجبور ہو جائیں گے اور اخبار میں میرا کوئی مضمون ہو گا تو وہ اسے پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور اس مضمون کے ذریعے میں ان سے ہر بات کر سکتی ہوں۔ ایسے کہ اس کے اصل مفہوم کو ان کے سوا کوئی سمجھ بھی نہیں سکے گا۔"

نجمی نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ اس عورت نے ہر قدم پر اسے حیران کیا تھا۔ اس میں ضبط اور حوصلہ بھی تھا، ذہانت بھی تھی اور قوت عمل بھی "آپ کا آئیڈیا بہت شاندار ہے لیکن اخبار نکالنا بے حد اعصاب شکن کام ہے۔"

"اعصاب شکن مراحل سے میں گزر چکی ہوں۔ بلکہ ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اعصاب شکن کام میرے بکھرے ہوئے اعصاب کو سمیٹنے میں مدد دے گا۔" فوزیہ نے کہا۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اس فیلڈ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس

کے لیے مجھے آپ کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔"

"نوعیت کی وضاحت بھی کر دیجئے۔" نجمی بولا "ویسے میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔"

"آپ مجھے اخبار کے لیے اہل اور محنتی کارکن فراہم کر سکتے ہیں اشاعت کے مراحل سے مجھے روشناس کرا سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو میرے اخبار کی ادارت کرنا ہوگی۔"

"اور میں آپ کو مشورے بھی دے سکتا ہوں؟"

"ظاہر ہے مجھے سب سے زیادہ ضرورت انہی کی ہوگی۔"

"تو میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ مجھے ایڈیٹر نہ بنائیں۔ میں اس کا اہل نہیں۔ ایڈیٹر جم کر بیٹھنے والا آدمی ہوتا ہے۔ جبکہ میں وہ لڑکا ہوں جو شہر بھر کے کوڑا گھروں کو چھانتا پھرتا ہے' ان چیزوں کی تلاش میں جو کار آمد ہوتی ہیں لیکن لوگ انہیں بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ اور ایڈیٹر ایسے تمام لڑکوں کی چن کر لائی ہوئی چیزوں کا معائنہ کر کے ان کی وقعت کا تعین کرتا ہے۔ فیصلہ کرتا ہے کہ کس چیز کو کب' کہاں' کیسے اور کس مقام پر استعمال کرنا ہے۔"

فوزیہ مایوس نظر آنے لگی "تو پھر؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے لیے اسٹاف کا بندوبست میں کر دوں گا۔ لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ آپ کا پہلا مسئلہ تو ڈکلیریشن کا حصول ہے۔"

"نام تجویز ہو جائے تو میں کل ہی درخواست دے دوں۔"

"بیگم صاحبہ' ڈکلریشن آسانی سے نہیں ملے گا۔" نجمی نے کہا۔

"اس جمہوری دور میں بھی!"

"جی ہاں۔ جمہوری حکومت عوامی مینڈیٹ سے قائم ہوتی ہے لہٰذا عوام کی طرف سے بے پردا ہوتی ہے۔ کیونکہ عوام تو احساس جرم کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اف بھی

نہیں کر سکتے۔ حکومت کو خطرہ بس عدلیہ اور صحافت سے ہوتا ہے۔ عدلیہ کو تو کسی طرح قابو کر لیا جاتا ہے کیونکہ تقرریوں کا اختیار حکومت کو ہوتا ہے۔ لیکن صحافت میں تمام لوگوں کو نہیں باندھ کر رکھا جا سکتا۔ صحافی درد سر بنے رہتے ہیں۔ اس لیے حکومت نئے آنے والوں کو بڑی سختی سے چیک کرتی ہے۔ بلکہ وہ چاہتی ہی نہیں کہ مزید لوگ آئیں اور اس کے درد سر میں اضافہ کا سبب بنیں۔"

"بہرکیف میرا خیال ہے کہ یہ کام ہو جائے گا۔ کچھ ایسے لوگوں سے میرے تعلقات ہیں جو یہ کام کرا سکتے ہیں۔"

"بس تو بسم اللہ کیجئے۔ لیکن ایک مشورہ اور بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ روزنامے کی بجائے ہفت روزے کا ارادہ کیجئے۔ اس میں درد سر اور پھیلاؤ کم ہوگا۔ ڈکلریشن بھی نسبتاً آسانی سے مل جائے گا۔"

فوزیہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ لگتا تھا فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے۔

"دیکھیں نا آپ کا مقصد ہفت روزے سے بھی پورا ہو سکتا ہے۔" نجمی نے کہا "بلکہ میرے خیال میں آپ کے مقصد کے حصول کے لیے ہفت روزہ زیادہ مؤثر رہے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"ہر اعتبار سے۔ کالم آپ کے لیے زیادہ موثر پیرایہ اظہار نہیں۔ افسانہ زیادہ مناسب رہے گا۔ اب آپ ہر روز ایک نئے انداز میں اپنے پیغام پر مبنی کالم تو لکھنے سے رہیں پھر عام قارئین بھی اس کالم میں اور طرح کی دلچسپی لیں گے۔ وہ انہیں مضحکہ خیز اور پھر معنویت سے پر لگے گا۔ افسانے میں یہ قباحت نہیں ہوتی۔ دوسرے اخبار کی زندگی بمشکل ایک دن ہوتی ہے' دوسرے دن وہ باسی ہو جاتا ہے۔ اسٹال پر اس کی گنجائش نہیں رہتی۔ جبکہ ہفت روزہ ہفتوں اسٹال پر موجود رہتا ہے۔"

فوزیہ سر کو تفہیمی جنبش دیتی رہی تھی "میں آپ کی بات سمجھ گئی۔" اس نے کہا

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"اس کا تجربہ ہو جانے کے بعد آپ چاہیں تو روزنامے کا اجرا بھی کر سکتی ہیں۔"

"بس تو یہ طے ہو گیا' ڈکلیریشن کی درخواست میں دے رہی ہوں۔ باقی سب کچھ آپ کو کرنا ہے۔ آپ سویرا سے استعفٰی دے دیں۔"

"بہت بہتر۔"

☆============☆============☆

عوامی لیب اینڈ بلڈ بینک کا افتتاح بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ صوبائی وزیر صحت تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ عاصم نے تقریب میں شرکت نہیں کی۔ وہ خود کو نمایاں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اس کی تجویز پر لیبارٹری کی پبلسٹی کے دوران یہ اعلان کیا گیا تھا کہ افتتاح کے روز کوئی بھی شخص مفت خون ٹیسٹ کرا سکتا ہے چنانچہ خون ٹیسٹ کرانے والوں کا ہجوم تھا۔ افتتاح کے بعد بابر نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس کا بلڈ بینک خون بطور عطیہ یا قیمتاً اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک خون دینے والے کے خون کی مکمل اسکریننگ نہ ہو جائے۔ اس نے اپنی تقریر میں اس بات کی اہمیت کو بھی واضح کیا تھا اور لوگوں کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔

اس رات بابر' عاصم سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ عاصم نے اس سے تقریب کا احوال سنا اور خوش ہوا "اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے لیکن تمہیں یہیں نہیں ٹھہرنا ہے۔" وہ بولا "میری خواہش ہے کہ ملک کے کم از کم ہر بڑے شہر میں لیبارٹری قائم کی جائے اور اسے اسی انداز میں چلایا جائے۔ یہ میری خواہش ہے۔"

"انشاء اللہ آپ کی خواہش پوری ہو کر رہے گی۔" بابر نے بے حد خلوص سے کہا "لیکن یہ آپ نے فلم کا کیا چکر چلایا ہے؟"

"تم جانتے ہو کہ یہ شوق مجھے لڑکپن سے تھا۔ مجھے خبط تھا کہ خوب صورت فلمیں بناؤں۔ اب فرصت ملی ہے تو سوچا کہ یہ شوق بھی پورا کر لیا جائے۔"

بابر اس بات سے واقف تھا۔ لیکن اس نے وطن واپس آ کر عاصم کو غیر معمولی صورت حال میں پایا تھا۔ پھر بے حد اہم آٹھ برسوں کے دوران وہ عاصم سے دور رہا تھا۔ اسے عاصم کی فلم میکنگ سے دلچسپی یاد تھی۔ مگر یوں فلمی دنیا میں داخل ہونا' نہ جانے کیوں اسے یہ سب بے حد غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ عاصم کا اسے فون کرنا۔ واپسی پر اپنے گھر کی بجائے طارق روڈ کے ایک فلیٹ میں تنہا زندگی گزارتے ملنا۔ بیوی بچوں سے دوری' اور یہ کہانی کہ وہ مجرم نہیں ہوتے ہوئے بھی مجرم ثابت ہو چکا ہے' یہ سب اسے افسانہ سا لگ رہا تھا۔ بابر بھی بچہ نہیں تھا۔ اس نے زندگی کا ایک حصہ پردیس میں اور تنہا گزارا تھا۔ اس میں سوجھ بوجھ بھی تھی اور ذہانت بھی۔ اس نے اب تک جو مشاہدہ کیا تھا وہ عاصم کی باتوں کی نفی کرتا تھا۔ پولیس سے چھپنے والے مجرم تو راہ میں کسی پولیس والے کو دیکھ لیں تو ان کا چہرہ فق پڑ جاتا ہے۔ عاصم کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ایسا شخص ہرگز نہیں لگتا تھا جس پر کوئی جرم' خواہ غلط ہی سہی' ثابت ہو گیا ہو اور وہ قانون سے چھپتا پھر رہا ہو۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس صورت میں اسے ملک سے نکلنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ وہ بہ آسانی کہیں بھی جا سکتا تھا۔ دولت اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔

تو پھر؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ عاصم سے کوئی اخلاقی جرم سرزد ہوا ہے۔ ایسا شخص بھی مجرم تو ہوتا ہی ہے۔ بابر کو اس خیال میں وزن محسوس ہوا۔ لگتا یہی تھا کہ عاصم خود اپنے آپ سے' اپنی بیوی اور بچوں سے بھاگ رہا ہے اور پھر فلمی دنیا میں جانا۔ بابر جانتا تھا کہ مصنوعی روشنیوں کی اس دنیا میں کون سے سکے چلتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ کہ اگر عاصم کی بیان کی ہوئی نامکمل کہانی درست تھی تو بھی عاصم کا بیوی کو کچھ نہ بتانا غیر فطری تھا۔ بابر' فوزیہ سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن فون پر اس سے بات ہوتی رہی تھی۔ فوزیہ اور بچوں کی تصویریں اسے باقاعدگی سے بھیجی جاتی رہی تھیں۔ فوزیہ اسے بہت اچھی لگی تھی اور عاصم تو تھا ہی بہت اچھا۔ اس گھرانے میں محبت ہی محبت' ہم آہنگی ہی ہم آہنگی تھی۔ ہاں یہ ایک جواز بنتا ہے کہ عاصم نے فوزیہ کو اس

لیے اپنے متعلق بے خبر رکھا کہ پولیس اس کے ذریعے اس کے متعلق معلوم نہ کر لے۔ ایسا ہوتا تو ہے لیکن بے حد ہاٹ کیسز میں۔ یہاں یہ بات بھی نہیں تھی۔ بابر کو وطن واپس آئے کافی دن ہو گئے تھے۔ وہ باقاعدگی سے اخبارات کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ مگر عاصم قریشی کے کسی کیس کی خبر کہیں نہیں چھپی تھی۔ نہ ہی یہ خبر چھپی تھی کہ پولیس فوزیہ قریشی سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے۔

مگر بابر یہ سب کچھ عاصم سے نہیں کہہ سکتا تھا نہ کچھ پوچھ سکتا تھا اور نہ ہی اس کے حکم کے خلاف کچھ کر سکتا تھا۔ وہ تو اس کا بندہ بے دام تھا۔ اس لیے کہ اسے سب کچھ یاد تھا۔ اس پل سے آج تک کا ہر لمحہ اسے یاد تھا۔ جب اس نے عاصم کو اور عاصم نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس پہلی شام اسے گھر لے جاتے ہوئے بڑے ابا اور بھائی جان پہلے بازار گئے تھے۔ اس کے لیے کپڑے خریدے گئے تھے اور کتابیں بھی۔ بھائی جان نے اصرار کر کے ادائیگی اپنی جیب سے کی تھی۔ اور اس سلسلے میں ہونے والی گفتگو بابر کو آج بھی یاد تھی۔

بھائی جان نے بڑے ابا سے کہا تھا "ابو' میں بابر کو اپنی ذمے داری کے طور پر قبول کر چکا ہوں۔ اس کے تمام اخراجات میں پورے کروں گا۔"

"لیکن بیٹے' ابو تو اس کا میں ہی ہوں۔" بڑے ابا نے کہا تھا۔

"ابو' یقین کریں وہ چھوٹا بھائی جی گیا ہوتا تب بھی میں یہی کرتا۔"

"مگر عاصم' میرے پاس جو کچھ بھی ہے تمہارا ہی تو ہے۔"

"نہیں ابو' جب میں تعلیم مکمل کر کے کاروبار سنبھالوں گا' تب یہ سب کچھ میرا ہو گا۔ ابھی نہیں ہے۔ ہاں ابھی میں آپ کی ذمے داری ہوں۔ بابر میری ذمے داری ہے۔"

"تو تعلیم کے دوران تم یہ ذمے داری کیسے اٹھاؤ گے؟" بڑے ابا یک لخت سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"پارٹ ٹائم جاب کروں گا اس کے لیے۔ آپ مجھے کام دیں گے نا؟"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ لیکن۔"

"بس ابو' یہ طے ہو گیا۔ اس میں کئی فائدے ہیں میرے۔ میں ذمے دار بھی ہو جاؤں گا اور دو سال بعد مجھے ایم بی اے کرنا ہے۔ اس کے لیے تربیت بھی ہو جائے گی۔ کاروبار کے رموز بھی سمجھ لوں گا میں۔"

بابر کو یاد تھا۔ خوب یاد تھا۔ اس کے اخراجات بھائی جان نے ہمیشہ اپنی تنخواہ سے پورے کیے تھے۔ بڑے ابا صرف اسے تحفے دے سکتے تھے۔ کاغذات پر وہ بڑے ابا کا بیٹا تھا لیکن اس کے اصل سرپرست بھائی جان تھے۔ ایسی محبت اور اس بچے کے لیے' جس نے آنکھیں کھول کر ماں باپ کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ جس نے زندگی کے چھ سال یتیم خانے میں گزارے تھے۔ جس کا روئے زمین پر کوئی اپنا نہیں تھا۔ بھائی جان نے تو اسے ہمیشہ کے لیے خرید لیا تھا۔ آج وہ جو کچھ بھی تھا' اللہ کے بعد بھائی جان کی بدولت تھا۔ وہ اگر بدترین مجرم بھی تھے' تب بھی اس کے لیے صرف بھائی جان تھے۔

"کہاں کھو گئے بھائی؟" عاصم نے اسے چونکا دیا۔

"کہیں نہیں بھائی جان۔ کبھی کبھی پرانی حسین یادیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔"

"اب تم عملی زندگی میں قدم رکھ چکے ہو بھائی۔ یادوں سے کھیلنا چھوڑ دو۔"

"کچھ یادیں تو سرمایہ حیات ہوتی ہیں بھائی جان۔" بابر نے گہری سانس لے کر کہا "خیر چھوڑیں۔" اچانک اس کے لہجے میں التجا در آئی۔ "بھائی جان۔ بھابی اور بچوں سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔"

"فی الحال یہ مناسب نہیں ہے بابر۔"

"بھائی جان' بھابی کتنی تنہا اور پریشان ہوں گی۔ بچوں پر کیا گزر رہی ہو گی۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' اس کا احساس تمہیں مجھ سے زیادہ ہو سکتا ہے۔" عاصم نے چڑچڑے پن سے کہا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنے لہجے کی درشتی کا احساس ہو گیا "معاف کرنا بابر' میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں بھائی جان۔ میں آپ کی کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ اب ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو بھائی۔ تم میرا سراغ بن سکتے ہو۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں پتا ہے کہ میں اور تمہاری بھابی تمہارے لیے ایک بہت پیاری لڑکی تلاش کر چکے ہیں۔" عاصم کا لہجہ خوش گوار ہو گیا "یہ الگ بات کہ تم پہلے ہی کسی کو پسند نہ کر چکے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں بھائی جان۔ آپ کے انتخاب سے اچھا کوئی ہو سکتا ہے بھلا۔"

"کاش! میں تمہاری شادی میں شریک ہو سکوں۔" عاصم کے لہجے میں حسرت تھی۔

☆============☆============☆

امداد پروڈکشنز کے آفس میں اب گدھوں کی بھیڑ نہیں رہتی تھی۔ فنانس کی تلاش میں آنے والے تمام گدھ اڑ چکے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ مرشد حسین نہ تو بے وقوف ہے اور نہ ہی عیاشی کے ارادے سے اس میدان میں اترا ہے۔ اس کے کچھ سنجیدہ قسم کے عزائم تھے جنہیں وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکے۔ ساتھ ہی انہیں یہ احساس بھی تھا کہ مرشد حسین کی نظریں انہیں آر پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور فلمی گدھ یہ بات کبھی پسند نہیں کرتے۔ مرشد حسین شاہ خرچ آدمی ضرور تھا مگر سمجھ دار اور منہ پھٹ بھی تھا۔ وہ ان میں سے ہر ایک کو واضح طور پر بتا چکا تھا کہ اس کی رائے میں وہ لوگ فلم میکنگ کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ لہٰذا اس کے کسی کام کے نہیں۔

یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی کہ مرشد حسین ملک کے ایک نامور ادیب سے ایک فلم کا اسکرپٹ لکھوا رہا ہے۔

اس دوران اسٹوڈیو کے مالک سعید ملک سے مرشد حسین کی بہت دوستی ہو گئی

تھی۔ وہ زیادہ وقت ملک صاحب کے عالی شان دفتر میں گزارتا، جہاں تاش کی محفلیں جمتی تھیں۔ کبھی وہ نہ جاتا تو ملک صاحب خود اس کے دفتر میں چلے آتے۔ حالانکہ وہ کبھی کسی پروڈیوسر کے آفس میں جانے کے روادار نہیں تھے۔ مرشد حسین کی وضع داری، انکسار اور خود اعتمادی نے ان کا دل جیت لیا تھا۔

ملک صاحب فلمی دنیا کی روایت کے مطابق نہایت شوقین مزاج آدمی تھے۔ فلم بنانے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسٹوڈیو سے جو کچھ کماتا ہوں، فلم میں کیوں گنواؤں۔ لیکن ہر اونٹ ایک دن پہاڑ کے نیچے ضرور آتا ہے۔ پچھلے دنوں وہ ایک حسین لڑکی کے پھیر میں ایسے آئے کہ فلم بنانے پر آمادہ ہو گئے۔ لڑکی کو مرشد حسین نے بھی دیکھا تھا۔ وہ بلاشبہ بہت حسین اور طرح دار لڑکی تھی لیکن مرشد حسین کا خیال تھا کہ اداکاری اس کے بس کی بات نہیں۔ ادھر لڑکی نے ملک صاحب کو ایسا شیشے میں اتارا تھا کہ وہ ایک معروف فلمی رائٹر سے خاص طور پر اس کے لیے فلم لکھوا رہے تھے۔

وہ لڑکی ہی مرشد حسین کے عظمت مرزا سے تعارف کا سبب بنی! اس روز وہ ملک صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر شخص آندھی طوفان کی طرح دفتر میں آیا "ملک صاحب، آپ اس نیلوفر کے بارے میں سنجیدہ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

ملک صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں "میں نے کبھی آپ سے مذاق نہیں کیا۔ پھر آپ کو یہ سوال کرنے کا حق کیسے مل گیا؟"

"ملک صاحب، اس لڑکی کو اسکرین ٹیسٹ کی ہرگز ضرورت نہیں۔ وہ ویسے بہت خوب صورت ہے لیکن فلم کے لیے نہیں۔ اداکاری تو خیر اسے آتی ہی نہیں۔ اسکرین پر اس کا حسن بھی جاتا رہے گا۔ وہ بس ایسے ہی ٹھیک ہے ملک صاحب۔" وہ شخص ایک آنکھ بند کر کے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

مرشد نے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا "میں نے آپ سے تبصرہ کرنے کو کب کہا مرزا صاحب؟"

"تبصرہ تو میں نے اب تک کیا ہی نہیں ہے ملک صاحب۔ وہ اب بن لیں۔ اس کا کوئی ٹیسٹ کرانا ہی ہے تو پورنو ٹیسٹ کرا لیں اور اسکرین ٹیسٹ کی کمی بیشی کے سلسلے میں مشورہ بھی سن لیں۔ وہ پلاسٹک سرجری کا کیس ہے سرجی۔ سرجری کے بعد اے ون ہو جائے گی۔ آج تک کی تمام اداکاراؤں کو مات دے دے گی۔"

مرشد کے کان مرزا کی آواز پر لگے تھے اور نظریں ملک صاحب کے چہرے پر جمی تھیں۔ اب ملک صاحب بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ لیکن مرزا کے اگلے جملے پر ان کا چہرہ پھر تپ اٹھا۔

"اداکاری آپ اسے پھر بھی نہیں سکھا سکیں گے۔ خیر جی' اب آپ مشورہ بھی سن لیں۔ نتھنوں کو پانچ ملی میٹر اوپر لے جاتے ہوئے مرکزی ناک کی تین ملی میٹر کی چھلائی کر دیں۔ بالائی ہونٹ کو خم دیتے ہوئے دو ملی میٹر چھیل دیں۔"

"بس مرزا صاحب۔" ملک صاحب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "آپ اب ایک لمحہ بھی نہ رکیے۔ فوراً تشریف لے جائیے یہاں سے۔ اور ہاں۔ ریاض کو بھیج دیجیے۔"

"بہتر ملک صاحب۔" وہ چلا گیا۔

مرشد حیران تھا۔ اس نے کبھی کسی کو ملک صاحب سے اس طرح بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بڑے بڑے پروڈیوسر ڈائریکٹران کے سامنے گھگیاتے تھے۔ جبکہ یہ مرزا تو کوئی ایسی اچھی حیثیت والا بھی نہیں تھا۔ بلکہ یقینی طور پر وہ کوئی فوٹو گرافر تھا۔ لیکن ملک صاحب اس سے آپ جناب کر کے بات کر رہے تھے۔

"یہ کون ذات شریف تھے؟" اس نے ملک صاحب سے پوچھا تھا۔

"ارے عظمت مرزا کو نہیں جانتے؟" ملک صاحب نے حیرت سے کہا۔

مرشد کو شاک لگا۔ یہ۔ عظمت مرزا؟ اسے یاد تھا کہ عظمت مرزا بہت وجیہہ اور خوش پوش آدمی تھا۔ وہ ایک بے مثال کیمرا مین تھا۔ فری لانسر تھا۔ ہر اچھی فلم کے لیے اسے سائن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ پھر وہ امریکا گیا اور وہاں ہدایت کاری کی باقاعدہ

تربیت حاصل کی' ڈپلوما لیا۔ وطن واپس آ کر اس نے ذاتی فلم پروڈیوس اور ڈائریکٹ کی اور اپنا سب کچھ اس میں جھونک دیا۔ وہ بہت خوب صورت فلم تھی۔ ناقدین نے اسے بے حد سراہا۔ اسے بے شمار ملکی اور غیر ملکی ایوارڈ ملے۔ لیکن اس فلم نے عظمت مرزا کا بھٹہ بٹھا دیا۔ انتقام کہیے یا سنبھلنے کی کوشش' طوفان کے بعد مرزا نے تین چار پنجابی فلمیں ڈائریکٹ کیں' دوسروں کے لیے۔ لیکن وہاں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر اس کا نام بھی سننے میں نہ آیا۔

"یہ۔ یہ عظمت مرزا؟" مرشد نے کہا "کیمرا مین ڈائریکٹر عظمت مرزا؟"

"ہاں۔ یہ وہی ہے۔ فلم لائن میں آدمی ایسے ہی تباہ ہوتا ہے۔ آخری فلم کی ناکامی کے بعد ہدایت کار کی حیثیت سے تو اس کا کیریئر ختم ہو گیا تھا۔ ہے یہ بہت باصلاحیت اور یہ بات جانتا بھی ہے۔ اس وقت بھی کیمرا مین کی حیثیت سے یہ ٹاپ پر تھا۔ لیکن اس نے ہر پیش کش ٹھکرا دی۔ کہنے لگا' اب مجھ سے ردی فلمیں نہیں ہوں گی۔ فلمیں ڈائریکٹ کرنے کے دوران اس نے ہر طرح کی لت بھی لگا لی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحت بھی تباہ ہو گئی۔ کام بھی نہیں تھا اور اسٹوڈیو کے علاوہ اس کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے اسٹوڈیو کے چیف کیمرا مین کی حیثیت سے کام کرنے کی پیش کش کی۔ اور جانتے ہو اس نے کس شرط پر قبول کی۔ یہ صرف میری فلم کے لیے عملی کام کرے گا۔ اور اب میرے ساتھ اس کا رویہ دیکھ لو۔"

اتنے میں کیمرا مین ریاض دفتر میں آ گیا "آپ نے مجھے بلوایا صاحب جی۔"

"نیلو فر کہاں ہے؟" ملک صاحب نے پوچھا۔

"وہ جی کیمرا ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ مرزا صاحب سے باتیں کر رہی ہے۔"

ملک صاحب پریشان نظر آنے لگے "نیلو فر کا موڈ کیسا ہے؟ باتیں کیا ہو رہی ہیں؟"

"نیلو جی کا موڈ بہت اچھا ہے صاحب جی۔ مرزا صاحب انہیں بتا رہے ہیں کہ ان کے اسکرین پر ٹیسٹ کی ضرورت نہیں۔ ان کی نظروں سے اچھا ٹیسٹ کیمرا نہیں کر سکتا۔

صاحب جی' میں کیا بتاؤں۔ انہوں نے نیلوفر کے حسن کی ایسی ایسی تعریف کی کہ میں نے کبھی نہیں سنی۔ نیلو جی نے بھی نہیں سنی ہو گی۔ اور اب وہ انہیں بتا رہے تھے کہ ملی میٹر اور انچ کا کیا تعلق ہے۔"

ملک صاحب مسکرائے "بس تم دوڑ جاؤ' اب وہ کسی بھی لمحے استرا بن جائے گا۔ تم نیلوفر کا اسکرین ٹیسٹ کرو گے۔"

"ٹھیک ہے صاحب جی۔"

"ملک صاحب' ایک بات کہوں۔" ریاض کے جانے کے بعد مرشد نے کہا۔

"دس کہو۔"

"عظمت مرزا کو آپ مجھے دے دیں۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ دیکھ رہے ہو' میں تو اب اس سے تنگ آ گیا ہوں۔"

"وہ میرے پاس آنا قبول کر لے گا؟"

"کیسے نہیں کرے گا۔ میری ملازمت میں ہے وہ۔" ملک صاحب نے اکڑ کر کہا "مگر شرط کے مطابق وہ میرے علاوہ کسی اور کی فلم شوٹ نہیں کرے گا۔"

"ٹھیک ہے' بس آپ اسے کہہ دیں کہ وہ میرے دفتر میں بیٹھا کرے۔"

ان کے درمیان پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دو گھنٹے بعد ریاض نیلو فر کے اسکرین ٹیسٹ کے تازہ پرنٹس لے آیا۔ ملک صاحب نے تصویروں پر ایک نظر ڈالی اور ان کا منہ اتر گیا۔ تمام تصویریں دیکھنے کے بعد انہوں نے مرشد کی طرف بڑھا دیں "دیکھو انہیں اور اس کی نظر کے قائل ہو جاؤ۔" انہوں نے کہا۔

وہ نیلوفر کی ہر زاویے سے لی گئی تصویریں تھیں۔ پہلی تصویر پر نظر ڈالتے ہی مرشد حیران رہ گیا۔ پھر ہر تصویر کے ساتھ اس کی حیرت بڑھتی گئی۔ بات ہی حیرت کی تھی۔ نیلوفر ہر اعتبار سے خوب صورت لڑکی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے کہیں عدم تناسب کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر کیمرے کی آنکھ نے اس کے چہرے میں عدم تناسب ڈھونڈ لیا تھا۔

مرشد کو مرزا کی کہی ہوئی ہر بات یاد تھی۔ اس نے تصور میں اس کی تجویز کردہ ترامیم پر عمل کر کے دیکھا اور اس کی نظر کا قائل ہو گیا۔ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ مرزا کی تجویز کردہ پیمائشیں تک درست ہوں گی۔

"ہیرا آدمی ہے آپ کے پاس۔" وہ تصویریں ملک صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"لیکن چاٹنے کے لیے۔" ملک صاحب نے زہریلے لہجے میں کہا "اور اب تمہارے پاس پہنچنے والا ہے۔"

☆============☆============☆

فوزیہ پہلے ہی مرحلے میں نجمی کی قائل ہو گئی۔ اس کی کہی ہوئی بات حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی تھی۔ اس کے پاس اثر و رسوخ بھی تھا اور پیسہ بھی۔ پھر بھی ڈکلیریشن کا حصول ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ فوزیہ کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ اگر اس نے روزنامے کے لیے درخواست دی ہوتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اسے تو ہفت روزے کے حصول میں پاپڑ بیلنے پڑ رہے تھے۔ جسے سرکاری زبان میں نیم بے ضرر سمجھا جاتا ہے۔

ڈکلیریشن کے علاوہ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ دفتر کا بندوبست کیا جا چکا تھا۔ اسٹاف رکھا جا چکا تھا۔ تین شماروں کا عام میٹر مکمل تھا۔ فوزیہ نے نجمی کی مدد سے وہ افسانہ مکمل کر لیا تھا جو درحقیقت عاصم کے نام کھلا خط تھا۔ وہ اس سے مطمئن بھی تھی۔ اس نے دل کی ہر بات اس میں کہہ دی تھی۔ ہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ چاہتی تھی کہ ابھی سے پبلسٹی شروع کر دی جائے لیکن نجمی نے اس موقع پر بھی اس سے اختلاف کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ضروری نہیں کہ اسی نام سے ڈکلیریشن ملے' جو ہم چاہتے ہیں۔ فارم میں متبادل نام اسی لیے طلب کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا پبلسٹی سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ ڈکلیریشن کس نام کا ملا ہے۔

اس عرصے میں یہ ضروری تھا کہ کام جاری رکھا جائے۔ فوزیہ کو یہ کام بہت اچھا لگا

تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مسائل سے اس کا ذہن بڑی حد تک ہٹ گیا تھا۔ اگر ان مسائل میں وہ نہ گھری ہوتی تو یقینا اس وقت کو بہت زیادہ انجوائے کرتی۔ اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ آسائش کے دنوں میں کچھ کرنے کا خیال لوگوں کو کم ہی سوجھتا ہے۔ کیونکہ مصروفیت کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی۔ خدا کا دیا سبھی کچھ موجود ہوتا ہے۔

نجمی فوزیہ کی ذہانت کا پہلے ہی قائل ہو گیا تھا۔ اب اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ فوزیہ معاملات کو کتنی تیزی سے سمجھتی ہے۔ اتنے سے عرصے میں پرچے کے بیشتر معاملات اور مراحل وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ اسے لوگوں کو ہینڈل کرنا' ان سے کام لینا بھی آتا تھا۔ اب صرف اشاعتی مراحل اس کی دسترس سے دور رہ گئے تھے۔ اور وہ بھی اس لیے کہ ابھی پرچا اشاعت کے مراحل سے نہیں گزرا تھا۔

ڈکلیریشن کے حصول کے سلسلے میں خاور کے ایک دوست صنعت کار فوزیہ کی مدد کر رہے تھے۔ ان کے حکومتی حلقوں میں اچھے تعلقات تھے۔ مگر اب تک ان کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ نئی حکومت نے اپنے پہلے سال میں ابھی تک کسی روزنامے یا ہفت روزے کے لیے ڈکلیریشن نہیں دیا تھا۔ کچھ یوں بھی تھا کہ ڈکلیریشن کے لیے درخواستیں بھی نہیں دی گئی تھیں۔ جس ترقی پذیر ملک میں کاغذ کی قیمت ہر سال چڑھتی ہو وہاں لفظوں کو فروغ کب ہوتا ہے۔ وہاں کتاب' اخبار یا رسالہ چھاپنے کی حماقت کون کرے اور کب تک کرے۔ یہاں تو اب کاغذ کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے چلتے ہوئے اخبار اور رسائل بند ہونے کے مرحلے میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی لیے تو ہر حکومت آٹے اور کاغذ کی قیمت میں خوف ناک اضافہ کرتی ہے۔ آٹے کی قیمت میں اس لیے کہ غریب آدمی آٹے کی فکر میں لگ جائے اور کوئی اور فکر نہ کرے۔ کاغذ کی قیمت میں اس لیے کہ کتاب کی اشاعت مشکل ہو جائے اور تعلیم اور اس کے نتیجے میں شعور عام نہ ہو جائے۔ اخبار اور رسائل کی قیمت اتنی بڑھ جائے کہ لوگوں

کی قوت خرید سے باہر ہو جائے۔ اس کے بعد لکھنے والے حق لکھتے رہیں' بے شک حق قلم ادا کرتے رہیں۔ قصیدہ خوانوں کے آنسو تو اشتہارات کا ریٹ بڑھا کر بھی پونچھے جا سکتے ہیں۔

فون کی گھنٹی بجی۔ فوزیہ نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف طاہر بیگ تھے۔ خاور ندیم کے صنعت کار دوست "سیکرٹری اطلاعات سے آپ کے لیے وقت لے لیا گیا ہے۔" انہوں نے فوزیہ کو خوش خبری سنائی "پرسوں سہ پہر تین بجے آپ اسلام آباد روانگی کا بندوبست کر لیں۔ پلیز' انہیں اپنے سیاسی خیالات کے بارے میں اچھی طرح مطمئن کر دیجئے گا۔ انشاء اللہ آپ کا کام ہو جائے گا۔"

"میں شکر گزار ہوں آپ کی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔"

ریسور رکھ کر فوزیہ نجمی کی طرف مڑی "مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ سیکرٹری اطلاعات سے وقت لے لیا گیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیسٹ آف لک" نجمی نے دفتر میں بیٹھے لوگوں کی طرف ہاتھ گھما کر اشارہ کیا "فور آل آف اس۔"

☆===========☆===========☆

ساڑھے گیارہ بجے عظمت مرزا امداد پروڈکشنز کے دفتر میں داخل ہوا اور بے تکلفی سے مرشد حسین کے سامنے بیٹھ گیا "آپ شاید مرشد حسین ہیں۔"

"جی ہاں" مرشد نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"حکم ہوا ہے کہ اب میں آپ کے دفتر میں حاضری لگایا کروں۔"

"فرمائش میری ہی تھی۔"

"وجہ پوچھ سکتا ہوں اس عنایت کی۔" عظمت مرزا کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

"بس آپ مجھے اچھے لگے تھے۔ جی چاہا کہ آپ کے ساتھ وقت گزارا جائے۔"

مرشد نے کہا۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں۔ لوگ مجھے محض مجبوراً برداشت کرتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ یہ بڑی ناقدری کا زمانہ ہے۔"

"مجھے کرنا کیا ہو گا؟"

"وہی جو کیمرا ڈیپارٹمنٹ میں کرتے تھے۔"

"وہاں تو میں لوگوں کا جینا عذاب کرتا تھا۔" مرزا نے سادگی سے کہا۔

"یہاں میں حاضر ہوں۔ ناکافی لگوں تو بتا دیجئے گا' کچھ اور لوگوں کو ملازم بھی رکھ لوں گا۔"

عظمت مرزا کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ورنہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ تک نہیں آئی ہو گی۔ اس لمحے وہ بہت پیارا لگا "آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ مگر فوراً ہی کھسیا بھی گیا "حالانکہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ مگر میں نے یہ بات کبھی ملک صاحب سے ان کی ملازمت کے دوران بھی نہیں کہی۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم کھرے آدمی ہوں بہرحال پسندیدگی کا شکریہ۔ یہ بتاؤ کیا پیو گے؟"

"کیا پی سکتا ہوں؟" مرزا نے بے بسی سے کہا "سنا ہے کہ آپ بدذوق آدمی ہیں۔"

مرشد کو ہنسی آگئی "بدذوق تو ہوں لیکن متواضع بھی ہوں۔" اس نے شگفتگی سے کہا "ویسے آپ کی خوش ذوقی کی حد کہاں تک ہے؟"

"اب تو کوئی حد نہیں۔" مرزا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک زمانے میں ایک ہی شوق تھا۔ خوب صورت فلم بنانے کا' جسے فن پارہ قرار دیا جائے۔ خبط تھا اچھے سے اچھا شاٹ ٹیک کرنے کا۔ خود کو خوش ذوق سمجھتا تھا۔ لیکن جب لوگوں نے ثابت کیا کہ میں

جسے فن پارہ سمجھ رہا تھا' وہ ڈبہ فلم تھی تو میں نے لوگوں کے معیار کے مطابق خوش ذوق بننے کا فیصلہ کیا۔ کمزور آدمی تھا نا۔ ایک ہی بار میں قلاش ہو گیا تھا۔ بس اس دن سے ہر طرح کی خوش ذوقی میں مبتلا ہوں۔ جسم' بوتل' سگریٹ' سب سے گزر چکا ہوں۔ اب بوٹی سے کام چلا رہا ہوں۔ سستی ہے نا۔" اس کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔

"میں تو آپ کی پرانی خوش ذوقی کا قائل ہوں۔ مرزا صاحب۔ طوفان کے حوالے سے آپ کا فین ہوں میں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس سے بہتر اور مکمل کوئی پاکستانی فلم آج تک نہیں دیکھی۔"

"طوفان کا خالق تو بہت پہلے مر گیا تھا مرشد صاحب یہ۔" مرزا نے اپنے جسم کی طرف اشارہ کیا "یہ تو ملبہ ہے اس کا۔"

"خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ آیئے اندر والے کمرے میں چلیں۔" مرشد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ عظمت مرزا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اندرونی کمرا بے حد آرام دہ اور آراستہ تھا "یہاں آرام سے بیٹھیں۔" مرشد نے کہا اور دیواری کیبنٹ کھول کر ایک بوتل نکال لی۔

☆===========☆===========☆

سیکرٹری اطلاعات سے ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے ایک دن پہلے ہی سرکاری اعلان جاری کر دیا گیا' جس کے تحت چھ ماہ تک کسی بھی قسم کے ڈکلیریشن پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ سیکرٹری صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ پابندی اٹھتے ہی ہفت روزہ "گلدان" کے لیے سرکاری اجازت نامہ جاری کر دیا جائے گا۔ یہ صورت حال بے حد مایوس کن تھی۔ لیکن کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ فوزیہ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اسٹاف کو خواہ مخواہ تنخواہ دینا پڑے گی۔ افسوس یہ تھا کہ اس کے سامنے موجود واحد در امکان بھی وقتی طور پر ہی سہی' بند ہو گیا تھا۔ اسے مزید چھ ماہ تک انتظار کرنا تھا۔

یہ خبر ملتے ہی اس نے اپنے فلیٹ کا رخ کیا اور بند ہو کر بیٹھ گئی۔ ڈپریشن کا یہ دورہ بہت شدید تھا جو تین دن تک جاری رہا۔

☆============☆============☆

دس بارہ دن میں مرشد نے دیکھ لیا کہ عظمت مرزا کتنا خوددار آدمی ہے۔ اس کے لہجے میں کبھی عاجزی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ نشے کے عادی لوگ نشے کے حصول کے لیے کسی کے بھی سامنے زمین پر ناک بھی گھسنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مے نوشی کے معاملے میں بھی وہ اعتدال کا حیرت انگیز مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی خود شراب کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

اس روز عظمت مرزا دفتر آیا تو مرشد بیٹھا ایک اسکرپٹ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسکرپٹ گزشتہ روز ہی مکمل ہوا تھا اور مرشد نے اس کی کئی کاپیاں بنوالی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے مرشد صاحب؟" مرزا نے پوچھا۔

"بہت دن عیش کر لیے۔" مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا "اب کام کے دن شروع ہو گئے ہیں۔ ایک کام کریں گے میرا؟؟"

"جی فرمائیے۔"

مرشد نے دراز کھول کر اسکرپٹ کی ایک اور کاپی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی "ایک نظر اس پر ڈال لیجئے۔ میں اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔"

عظمت مرزا نے ہچکچاتے ہوئے اسکرپٹ لے لیا۔ مرشد سر جھکا کر دوبارہ اسکرپٹ کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن وقفے وقفے سے سر اٹھا کر وہ عظمت مرزا کے چہرے پر نظر ضرور ڈال لیتا تھا اور وہاں ہر بار اسے حوصلہ افزا تاثر نظر آتا۔ مرزا کا انہماک دیدنی تھا۔

کبھی اس کا چہرہ تمتمانے لگتا اور کبھی اس پر دبا دبا جوش نظر آتا۔ لیکن یہ طے تھا کہ اسے اس وقت یہ بھی احساس نہیں ہے کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ دیکھے جانے کا احساس تو دور کی بات تھی۔

ڈیڑھ بجے مرشد نے اسے پکارا "اب اسے چھوڑ دیں مرزا صاحب۔ پہلے کھانا کھالیں۔ پھر پڑھ لیجئے گا۔"

عظمت مرزا نے چونک کر دیکھا "مجھے تو خواہش نہیں ہے۔ آپ کھا لیجئے۔"

"یہ نہیں چلے گی مرزا صاحب۔ اسکرپٹ کوئی بھاگا تو نہیں جا رہا ہے۔"

"یہ بات نہیں۔" مرزا نے کھسیا کر کہا "مجھے واقعی بھوک نہیں ہے۔"

"پھر بھی دو چار لقمے تو لے لیں۔ چلئے۔"

مرشد کے اصرار نے مرزا کو مجبور کر دیا۔ دونوں اٹھ کر اندر والے کمرے میں چلے گئے۔ چپراسی کھانا لگا چکا تھا۔ خلاف توقع مرزا نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد مرزا نے کہا "مرشد صاحب، آج آپ نے چائے بھی نہیں پلوائی۔"

"چائے آپ پیتے ہی کب ہیں؟"

مرزا کھسیا گیا "کام کے دوران تو یہ ہوتا ہے کہ چائے پینے کے پانچ منٹ بعد یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ چائے پی تھی یا نہیں۔"

"فکر نہ کریں۔ اب آپ کی پیالی خالی نہیں رہنے دیں گے۔" مرشد نے کہا۔ پھر اس نے چپراسی کو آواز دی "نذیر ادھر آؤ۔ بھئی چائے کا بندوبست کرو فرسٹ کلاس۔"

مرزا نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر نذیر کی طرف بڑھایا "میرے لیے سگریٹ بھی لے آنا۔ دو پیکٹ۔"

"آجائے گی سگریٹ بھی۔ نذیر کے پاس پیسے ہیں۔" مرشد نے کہا۔

"نہیں میاں صاحب۔ سگریٹ کے معاملے میں یہ نہ کریں۔ میں ویسے ہی کم زیر بار نہیں ہوں آپ کا۔"

مرشد نے بحث نہیں کی۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ پھر اسکرپٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شام سات بجے مرشد نے اسکرپٹ تہہ کر کے ایک طرف رکھا "مرزا صاحب، پڑھ لیا آپ نے؟"

مرزا نے چونک کر دیکھا "جی نہیں، ابھی تو آدھے کے قریب باقی ہے۔"

تب مرشد نے دیکھا کہ مرزا کے کانوں کے اوپر پنسل رکھی ہے۔ وہ دیر تک اسے پڑھتے دیکھتا رہا۔ مرزا پھر منہمک ہو گیا تھا کبھی وہ پڑھتے پڑھتے کئی ورق الٹ کر پیچھے دیکھتا۔ کبھی حاشئے میں پنسل سے کچھ لکھتا۔ آٹھ بجے مرشد نے کہا "مرزا صاحب، میں تو اب گھر جا رہا ہوں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

مرزا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا "میاں صاحب، میں رات دفتر میں گزار سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔"

"دراصل میں اسکرپٹ پوری طرح پڑھے بغیر نہیں اٹھنا چاہتا۔" مرزا کے لہجے میں شرمندگی تھی "گھر جانے میں تو خاصا وقت لگے گا۔"

"میں نذیر سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ آپ کا خیال رکھے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے گا۔"

"شکریہ میاں صاحب۔"

"ہاں، اسکرپٹ آپ کو کیسا لگا؟"

"پورا اسکرپٹ پڑھے بغیر میں تبصرہ نہیں کروں گا۔"

"چلئے یہی سہی۔ اب چلتا ہوں۔ کل ملاقات ہو گی۔" مرشد نے کہا اور باہر نکل آیا۔ وہ جمعرات کی رات تھی اور جمعرات کو بابر اس کے پاس آتا تھا۔ دونوں جمعرات کی رات اور جمعے کا دن ساتھ گزارتے۔ ہفتے کو بابر پھر لیب چلا جاتا۔

☆===========☆===========☆

"بہت جان دار، مربوط اور مکمل اسکرپٹ ہے۔" عظمت مرزا نے گہری سانس لے

کر کہا "اس اسکرپٹ کو کوئی ہدایت کار محض فلما بھی لے تو بڑا ہدایت کار کہلائے گا۔ کون یہ بات سمجھے گا کہ یہ صرف اسکرپٹ کا کمال ہے۔"

"اور اگر یہ اسکرپٹ کسی باکمال ہدایت کار کو مل جائے تو؟" مرشد نے پوچھا۔

"تو بلاشبہ یہ ایک عظیم فلم ہو گی۔ یہ خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" ہے نا؟"

"جی ہاں۔ میں نے اس میں کچھ تبدیلیاں کرائی ہیں۔"

"کاش! طوفان کا اسکرپٹ ایسا ہی ہوتا۔ یہ اسکرپٹ پڑھنے کے بعد پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ طوفان کا اسکرپٹ کمزور تھا۔"

"آپ نے فلم کے ہیرو اور ہیروئن کو کتنا معاوضہ دیا تھا؟" مرشد نے پوچھا۔

"ساڑھے تین لاکھ روپے۔"

"اور رائٹر کو کیا دیا تھا؟"

"سات ہزار۔"

"میں نے یہ اسکرپٹ ڈیڑھ ماہ میں مکمل کرایا ہے اور معاوضہ ایک لاکھ دیا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کو شاید میں دس ہزار سے زیادہ نہیں دوں گا۔"

مرزا نے اسے حیرت سے دیکھا "ایک لاکھ؟"

"جی ہاں میں زیادہ اہم چیزوں پر زیادہ پیسہ خرچ کرنے کا قائل ہوں۔ اسکرپٹ فلم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ ہیرو ہیروئن تو میں کسی کو بھی بنا دوں۔"

عظمت مرزا اب اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا "آپ بہت ذہین پروڈیوسر لگتے ہیں۔ حالانکہ فلم کا تجربہ نہیں ہے آپ کو۔"

"میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ فلم کے آرٹ کو بھی سمجھتا ہوں لیکن آرٹ فلم اور کمرشل فلم کی اصطلاحات میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ فلم میرے نزدیک کمرشل آرٹ ہے۔"

"لیکن اچھی سے اچھی فلم تجارتی اعتبار سے بری طرح ناکام ہو سکتی ہے۔"

"یہ حقیقت ہے۔ سو میں ایک اچھے بزنس مین کی طرح خسارے کے اس امکان کو اور طرح سے کور کروں گا۔"

"کیسے؟" مرزا کے لہجے میں تجسس تھا۔

"یہ بزنس سیکرٹ ہے۔" مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ عظمت مرزا بھی اسکرپٹ کو اٹھاتا' چند اوراق الٹتا' نظر ڈالتا اور پھر رکھ دیتا۔ وہ ہچکچا رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" مرشد نے اس سے پوچھا۔

"میں۔ میں۔ کچھ نہیں" مرزا کہتے کہتے رک گیا۔ وہ اب بھی گومگو کے عالم میں تھا

"میری ایک التجا ہے آپ سے۔"

"جی فرمائیے۔"

مرزا کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کا حال اس بچے کا سا تھا جس کا چاند کھلونا نیچے اتر آیا ہو۔ مگر پھر بھی اس کی پہنچ سے دور ہو اور وہ کسی بڑے سے امید کر رہا ہو کہ وہ چاند کو پکڑ کر اسے دے دے گا۔ آخر کار وہ یوں پھٹ پڑا' جیسے یقین ہو کہ عام انداز میں اپنا مدعا کبھی بیان نہ کر سکے گا "میں اپنی اہلیت تو ثابت نہیں کر سکتا مرشد صاحب لیکن میری آرزو ہے کہ آپ یہ فلم بنانے کا موقع مجھے دیں۔"

"آپ کی اہلیت ثابت کرنے کے لیے تو طوفان ہی کافی ہے۔" مرشد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن میں کبھی کوئی بڑا فیصلہ عجلت میں نہیں کرتا۔"

"پلیز مرشد صاحب۔" عظمت مرزا اب گھگیا رہا تھا اور یہ وہ شخص تھا' جس نے مفلسی میں بھی خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ یہ رویہ ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ ایک سچا فنکار ہے اور اب وہ ایک اچھا اسکرپٹ دیکھ کر بچے کی طرح مچل رہا تھا۔ خوشامدیں کر رہا تھا۔ وہ تڑپ اٹھا تھا' کچھ کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

مرشد نے سوچا' ابھی لوہے کو اور گرم کرنا ہو گا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں مرزا صاحب کہ آپ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچوں گا۔" مرشد نے کہا "آپ فنکار تو ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ بزنس مین بھی بن جائیں۔ بزنس کے اسرار و رموز مجھ سے سیکھ لیں۔"

"آپ جیسا کہیں گے' میں ویسا ہی کروں گا۔"

"میرا کہنا ہے کہ فلم بناتے ہوئے باکس کو اپنی کمزوری کبھی نہ بنائیں۔ فن کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہ کریں۔ ہاں' اس میں ہونے والے ممکنہ نقصان کو کہیں اور سے پورا کرنے کی سبیل ضرور کریں۔" مرشد نے کچھ توقف کیا "میں دیکھوں گا کہ میرا طریق کار آپ کو پسند آتا ہے یا نہیں۔"

"جیسی فلم آپ بنا رہے ہیں۔" مرزا نے میز پر رکھے اسکرپٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایسی فلمیں بنانے کے مواقع حاصل کرنے کے لیے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"دیکھیں گے۔ فی الحال تو میں "نئے چہروں کی ضرورت ہے۔" کا یہ اشتہار ملک کے تمام بڑے اخباروں میں دے رہا ہوں۔ اس کا رسپانس زبردست آئے گا۔ ہم انٹرویو کریں گے' آپ میرے ساتھ موجود ہوں گے۔ اس موقع کے لیے میں آپ کو پہلا کاروباری گر بتا رہا ہوں۔ یہ ہر موقع پر کام آئے گا۔"

عظمت مرزا ہمہ تن سماعت تھا۔

"اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھیں۔ سامنے والے پر اپنی دلچسپی کبھی ظاہر نہ ہونے دیں۔ اسکرپٹ کے معاملے میں بھی آپ سے غلطی ہوئی تھی اور......"

عظمت مرزا سر کو تفہیمی جنبش دیتا رہا۔

☆===========☆===========☆

صوفیہ نے چوکیدار کو امداد پروڈکشنز کا انٹرویو لیٹر دکھایا۔ چوکیدار نے بغلی دروازہ کھول کر اسے اشارے سے بتایا "اس طرف سے۔"

"شکریہ۔ دفتر ڈھونڈنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔" صوفیہ نے اس کی بات کاٹ دی اور اسٹوڈیو میں داخل ہو گئی۔

دفتر ڈھونڈنے میں اسے واقعی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بیرونی کمرے میں دروازے پر رکھے اسٹول پر چپراسی بیٹھا تھا۔ ایک میز کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ صوفیہ نے انٹرویو لیٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے ایک نظر لیٹر پر ڈالی اور کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تشریف رکھیے' آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔"

صوفیہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

صوفیہ ایک باغی لڑکی تھی۔ لیکن اب سے دو سال پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے مزاج میں بغاوت ہے۔ تب وہ سیکنڈ ایئر کی معصوم سی طالبہ تھی جس نے کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی تھی۔ ماں باپ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ لیکن بڑے بھائی نے سوتیلا ہونے کے باوجود بڑی محبت سے اسے پالا تھا۔ وہ محبت اس کا سرمایہ حیات تھی۔ لیکن ایک روز وہ تہی دامن رہ گئی۔

ان کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ زمینیں تھیں' بہت بڑی جاگیر تھی۔ بہت احترام کیا جاتا تھا بھائی جان کا۔ ان کے گھر بڑی بڑی پارٹیاں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے سیاست دان آتے تھے۔ سیاسی جوڑ توڑ کی باتیں ہوتی تھیں۔ بھائی جان پیسہ پانی کی طرح بہانے کے قائل تھے۔ اکثر بھابی سے کہتے "ہمارے مطلب کی حکومت آ جائے تو وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔"

"کیوں' آپ کو کیا مل جائے گا؟" بھابی پوچھتیں۔

"تم نہیں سمجھو گی ان باتوں کو۔ شوگر ملز کے لیے قرضہ مل جائے گا۔"

"تو قرضہ ادا بھی تو کرنا ہو گا' سود سمیت۔"

بھائی جان ہنسنے لگتے "قرضہ چھوٹا موٹا ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہاؤس بلڈنگ کا یا عام کسانوں کو ملنے والا قرضہ۔ بڑا قرضہ کون ادا کرتا ہے؟"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔"

"تمہارے سمجھنے کی ہیں بھی نہیں۔"

صوفیہ کو ان باتوں سے ویسے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آبائی زمین بکتے بکتے سمٹتی جا رہی ہے اور جو رہ گئی ہے وہ قابل کاشت کم ہی ہے۔ اسے تو اپنے حصے سے بھی غرض نہیں تھی۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلا کہ بھائی جان اب اس قرضے پر انحصار کر رہے تھے۔

اس روز گھر میں دعوت تھی۔ دعوت میں ایک وزیر صاحب بھی شریک تھے۔ محدود سی پارٹی تھی لیکن اہتمام بہت زیادہ کیا گیا تھا۔ صوفیہ معمول کے مطابق کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسے صبح انگریزی کے ٹیسٹ کے لیے تیاری کرنا تھی۔ پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ اس کی آنکھ اس احساس سے کھلی کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ اسے یاد تھا کہ اس نے سونے سے پہلے کمرے کا دروازہ لاک کیا تھا اور نائٹ بلب بھی آن کیا تھا مگر اب کمرے میں اندھیرا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی "کون ہے؟" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ڈرو نہیں بے بی۔" ایک اجنبی آواز ابھری۔

اس نے ٹٹول کر بیڈ سائیڈ لیمپ روشن کر دیا۔ یہ دیکھ کر اسے دھچکا لگا کہ وزیر صاحب اس کے کمرے میں موجود ہیں۔

وزیر صاحب کے جانے کے بعد اس نے خود کو سمیٹا۔ وہ اٹھ رہی تھی کہ اسے قالین پر پڑی چابی نظر آئی۔ وہ یقیناً اس کے کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی اور پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ وزیر صاحب بھائی جان کو وہی فائل دے رہے تھے جو انہوں نے کمرے میں اسے دکھائی تھی۔ پھر اس نے واضح طور پر وزیر صاحب کو کہتے سنا۔ آواز بلند نہیں تھی مگر رات کے سکوت میں تو سرگوشی بھی بلند آہنگ ہو جاتی ہے "آپ بے فکر ہو جائیں افضل صاحب'

سمجھ لیں کہ آپ کا کام ہو گیا۔ آپ یہ فائل کل مینجر کے پاس لے جائیے گا' میں گیارہ بجے فون کر دوں گا مینجر کو۔"

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ اسے یاد آیا کہ منسٹر صاحب نے وہ فائل اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا "بے بی' یہ تمہارے بھائی جان کے شوگر ملز کے قرضے کی فائل ہے۔ مجھے اس پر دستخط کرنے ہیں۔ اس لیے یہاں آیا ہوں۔"

"لیکن یہاں آنا کیوں ضروری تھا؟"

"ایسے کام سکون سے کہیں بیٹھ کر ہی کیے جاتے ہیں۔ ویسے تمہارے بھائی جان نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں کوئی بھی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔" انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔ اس وقت صوفیہ کو یقین نہیں آیا تھا۔ مگر اب اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

وہ خاموشی سے لٹ گئی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ مزاحمت یا شور مچانا بے سود ثابت ہو گا۔ لیکن اس لمحے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے اندر ایک بہت باغی روح موجود ہے۔ اور اب وہ باغی روح مرتے دم تک چین سے نہیں بیٹھے گی۔ اس نے اپنی مرضی سے خود کو سیکڑوں بار استعمال کر کے دیکھ لیا۔ مگر وہ ایک بار مرضی کے خلاف استعمال ہونے کا داغ نہ دھل سکا۔ اس نے گھر کے نوکروں تک کو نہیں بخشا۔ بھائی جان کو ذلیل کیا' جنہوں نے اس پر آنکھیں نکالنے کی حماقت کی تھی۔ پھر وہ ماڈلنگ کی طرف چلی گئی۔ اب ماڈلنگ میں مسابقت بہت زیادہ تھی۔ جہاں ایک ماڈل کی ضرورت ہوتی وہاں بلامبالغہ پچاس ماڈل موجود ہوتیں اس لیے کہ اچھے گھروں کی لڑکیاں اب بلاجھجک اس میدان میں اتر رہی تھی طلب کم تھی اور رسد زیادہ۔ لہٰذا وقعت کم ہو گئی تھی مگر صوفیہ کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو گھر سے بے وقعت ہو کر نکلی تھی۔

پھر اس نے گھر ہی چھوڑ دیا اور پوری طرح آزاد ہو گئی اور اب وہ فلمی دنیا میں اترنے کے لیے پر تول رہی تھی۔

چپراسی کی آواز نے اسے چونکا دیا "مس صاب۔ صاب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔"

☆===========☆===========☆

عظمت مرزا بے حد مایوس نظر آ رہا تھا۔ مرشد حسین نے ایک ہزار سے زائد درخواستوں میں سے اس کی مدد سے صرف سات لڑکیوں کا انتخاب کیا تھا اب تک وہ چھ لڑکیوں کا انٹرویو کر چکے تھے۔ دو خود ہی دست بردار ہو گئی تھیں اور چار کو مرشد نے مسترد کر دیا تھا۔ وہ سوال ہی اس نوعیت کے کر رہا تھا کہ کسی لڑکی کا منتخب ہونا ناممکن لگتا تھا۔

مرشد نے مرزا کی مایوسی بھانپ لی "فکر نہ کریں مرزا صاحب۔" اس نے اسے دلاسا دیا۔ "یہ نہ بھولیں کہ ہمارے پاس ابھی ایک ہزار سے زائد امیدوار موجود ہیں۔"

"لیکن ان میں دو بہت اہل لڑکیاں نکل گئیں۔"

"آپ کے ذہن میں اہلیت کا مکمل تصور نہیں ہے۔ وہ پوری طرح اہل نہیں تھیں اور میں بعد میں کوئی پریشانی نہیں اٹھانا چاہتا۔"

"کیسی پریشانی؟"

"آپ ابھی نہیں سمجھ سکتے مرزا صاحب۔ آپ کو یاد ہے' میں نے اصل فلم پر لگنے والے سرمائے کے رسک کو کور کرنے کی بات کی تھی۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔"

"جی بہت بہتر۔"

اسی لمحے صوفیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ مرشد اگلے ہی لمحے مرزا کو دیکھنے لگا۔ مرزا کی آنکھوں کی چمک نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ لڑکی نے اپنی جو تصویر بھیجی تھی' وہ اس کے حسن کا احاطہ نہیں کر سکی تھی۔ بلاشبہ وہ غیر معمولی طور پر حسین لڑکی تھی۔ تصویر کے لحاظ سے ترجیحی فہرست میں اسے ساتواں نمبر ملا تھا لیکن درحقیقت وہ ایک نمبر تھی۔ اس کا چہرہ بھی ایسا تھا کہ لگتا تھا' تاثرات اس پر سے پھسلتے ہوں گے۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ وہ بہت بڑی اداکارہ

بن سکتی ہے۔

"تشریف رکھیے۔" مرشد نے لڑکی سے کہا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں مرزا کو پہلا کاروباری درس یاد دلایا۔ مرزا نے آہستہ سے اثبات میں سرہلا دیا۔

"شکریہ" لڑکی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بے حد مترنم اور لہجہ بہت شیریں تھا۔ یعنی وہ سرتاپا موزوں تھی۔ اب صرف اس کا ذہن چیک کرنا تھا۔

مرشد کو احساس ہوا کہ لڑکی بھی اسے تولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نام' پتا پوچھنے اور چند رسمی سوالات کرنے کے بعد مرشد نے اچانک پوچھا "آپ فلم میں کیوں آنا چاہتی ہیں؟"

"اس کے گلیمر کی وجہ سے۔" لڑکی نے بے جھجک کہا۔

"آپ کو معلوم ہے' اس گلیمر کی کیا قیمت ادا کرنا ہوتی ہے؟"

"جی ہاں' جانتی ہوں۔" لڑکی نے بے ساختہ کہا "وہ قیمت میں پہلے ہی کہیں اور ادا کر چکی ہوں۔"

اس جواب سے مرشد بھی سناٹے میں آ گیا۔ پھر اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا "آپ کو معلوم ہے' یہاں آنے کے لیے ضروری ہے کہ عزت کا تصور گھر میں چھوڑ کر نکلا جائے۔"

"عزت کا تصور تو گھر کی چار دیواری میں ہی چکنا چور ہوا تھا۔" صوفیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب تو میں بس مردوں کے دلوں کو تاراج کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ اسٹار بن گئیں' جس کا خاصا قوی امکان ہے تو آپ لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن جائیں گی۔ لوگ آپ کے ایک اشارے پر آپ کے قدموں میں بیٹھ جائیں گے۔ لیکن خود آپ ڈائریکٹر کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی ہوں گی۔ عزت نفس تک قربان کرنا پڑے گی آپ کو۔"

"چٹخے ہوئے شیشے میں عزت نفس کہاں ہوتی ہے۔"

"عزت نفس کبھی ختم نہیں ہوتی۔" مرشد نے مربیانہ لہجے میں کہا "تم ایک حقیقت پسند لڑکی ہونے کے باوجود یہ بات نہیں سمجھ رہی ہو۔ بہرحال تم حیرت انگیز لڑکی ثابت ہوئی ہو۔ لگتا ہے گھر سے تیار ہو کر نکلی ہو۔"

"مجھے آپ حیرت انگیز آدمی لگے ہیں۔" صوفیہ نے ترکی بہ ترکی کہا "آپ تو مجھے بھگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اس دنیا کے متعلق سنا ہے کہ یہاں ابتدا میں اچھی اچھی باتیں کی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ جو آپ ابتدا میں زبانی سنا رہے ہیں' یہ تو بعد کا مرحلہ ہوتا ہے۔"

"ہاں میں بھی تمہاری طرح حیرت انگیز ہوں۔"

"مجھے آپ لوگوں کے ساتھ کام کر کے خوشی ہو گی۔"

"اچھا صوفیہ' نام کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"جو جی چاہے نام دے دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اعتراض کرنے کے حق سے میں پہلے ہی دست بردار ہو چکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے صوفیہ۔ آپ کا فون نمبر میرے پاس ہے۔ میں دو تین دن میں آپ سے رابطہ کروں گا۔" مرشد نے اسکرپٹ کی ایک کاپی اس کی طرف بڑھائی "اس دوران آپ اسکرپٹ کا مطالعہ کر لیں۔ ابھی کچھ حتمی نہیں ہے۔ اگلی ملاقات میں ممکن ہے' معاہدے پر دستخط ہو جائیں۔"

ایک لمحے کو صوفیہ مایوس نظر آئی مگر پھر وہ مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھی "بہت بہتر' میں آپ کی کال کا انتظار کروں گی۔"

اس کے جانے کے بعد مرشد نے سوالیہ نظروں سے عظمت مرزا کو دیکھا "کیا خیال ہے مرزا صاحب؟"

"میرے خیال میں تو ہیرا مل گیا ہے ہمیں۔"

"میرے ذہن میں ایسی ہی لڑکی کا خیال تھا۔ مرشد نے کہا "اب آپ اپنی بات

کریں۔ آپ اس فلم کو ڈائریکٹ کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں اور آپ کی ہر شرط مجھے منظور ہو گی۔ بس مجھے آزادانہ کام کرنے دیجئے گا۔"

"اور معاوضہ؟"

"معاوضہ آپ نہ بھی دیں تو مجھے منظور ہے۔"

"میرے ذہن میں آپ کے لیے معاوضہ کا تصور ہے بھی نہیں۔ بہرحال یہ کل آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ فی الوقت مجھے آپ سے ایک اور اہم معاملے پر بات کرنی ہے۔ یہ سرمائے کے رسک کو کور کرنے کا معاملہ ہے۔"

"مجھے اس سلسلے میں بڑا تجسّس ہے میاں صاحب۔"

"ارے عام سی بات ہے' ہم اپنی اچھی فلم کو پورنو سے کور کر سکتے ہیں۔"

عظمت مرزا کا منہ بن گیا۔ اندر کا فنکار اپنی خودداری سمیت پھر جاگ گیا "آپ مجھ سے اس گھٹیا پن کی امید رکھتے ہیں۔"

"دیکھیے مرزا صاحب' آپ نے طوفان بنائی۔ وہ نہایت اعلیٰ فلم تھی مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ کیا اس کے بعد کی پنجابی فلمیں گھٹیا نہیں تھیں۔ اور اس کے بعد کیا ہوا۔ آپ عضو معطل بن کر رہ گئے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ ایک شاہ کار فلم بنائیں اور پھر اس حال کو پہنچ جائیں۔ ویسے آپ کی مرضی۔ آپ جیسا نہ سہی' بہرحال کوئی اچھا ڈائریکٹر مل ہی جائے گا مجھے۔"

مرزا یوں سمٹا جیسے اسکے جسم پر کوئی نادیدہ کوڑا پڑا ہو۔

"ویسے جو آپ سمجھ رہے ہیں' میرا خیال اس سے مختلف ہے۔" مرشد نے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کی "میں سولو پورنو بنانا چاہتا ہوں۔ گھٹیا قسم کی فحاشی نہیں۔ آپ جیسا ہدایت کار اسے آرٹ فلم کے درجے پر پہنچا سکتا ہے۔ میرے ذہن میں اس کے منظر نامے کا ہلکا سا خاکہ بھی ہے۔"

"لیکن میاں صاحب، مخرب اخلاق تو وہ پھر بھی رہے گی۔ ہم چند ہزار کے لیے قوم کو اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ پن کی طرف کیوں دھکیلیں۔"

"آپ کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہیں مرزا صاحب۔" مرشد نے سرد لہجے میں کہا "میری نظر میں ایسے لوگ ہیں جنہیں ان فلموں میں دلچسپی ہے، جنہیں میں قوم میں شامل بھی نہیں سمجھتا۔ شوقین مزاج جاگیردار ہیں کچھ، جن کی اوپر، بہت اوپر تک رسائی ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب یہاں اسٹوڈیو بھی آتے رہتے ہیں۔ ملک صاحب کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی تھی میری۔ ان سے میں کس طرح ڈیل کروں گا یہ آپ خود دیکھ لیجئے گا۔"

"لیکن انہیں اس کیسٹ کو تجارتی پیمانے پر ریلیز کرنے سے کون روکے گا۔"

"میں روکوں گا۔ اول تو وہ اس طرح کے آدمی نہیں ہیں اور پھر میں ان سے یہ شرط منواؤں گا۔"

"اور بعد میں وہ مکر گئے تو؟"

"تو وہ بہت پچھتائیں گے۔ آپ خود دیکھ لیجئے گا۔ بولیے کیا کہتے ہیں آپ؟"

مرزا سوچ میں پڑ گیا۔ "ٹوٹے ستارے" کا اسکرپٹ اسے اتنا بھا گیا تھا کہ وہ اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ دوسری طرف مرشد حسین کی بات کسی حد تک اس کے دل کو لگتی تھی۔ ایسی فلم عیاش طبع بڑے لوگوں تک محدود رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بس معاشرے کی عام اور معصوم اکثریت کو اس سے محفوظ رہنا چاہیے تھا۔ اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، آپ مجھے خاکہ سنائیے۔"

"اس فلم کا نام ہے "صبح بخیر، شب بخیر۔" اس میں صرف ایک کردار ہے ایک لڑکی، جو گھر میں اکیلی ہے۔ پہلے شاٹ میں ہم صبح سات بجے اسے نیند میں کسمساتا دکھائیں گے۔ پھر وہ اٹھتی ہے۔"

مرشد کہتا گیا اور عظمت مرزا سرہلاتا گیا۔ اس کی نگاہوں میں مرشد کے لیے ستائش

تھی۔ مرشد کے خاموش ہونے کے بعد وہ بولا "آپ کا کہنا درست ہے میاں صاحب۔ یہ تو اچھی خاصی فلم بن جائے گی۔ میاں صاحب، آپ کا ذہن، آپ کی نظر تو ڈائرکٹر والی ہے۔ کمال کر دیا آپ نے۔"

"اس کا اسکرپٹ لکھ کر مجھ دے دیں۔" مرشد نے اپنی تعریف کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "کتنا وقت لگ جائے گا اس میں۔"

یوں تو چند گھنٹے کا کام ہے لیکن میں اس پر خاصی توجہ دوں گا۔ دو دن تو ضرور دے دیجئے مجھے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ کام شروع کر دیں۔" مرشد نے جیب سے ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر مرزا کی طرف بڑھائے "یہ وقتی ضروریات کے لیے ہیں۔ کل انشاء اللہ پکا بندوبست کروں گا میں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو نذیر سے منگوا لیجئے گا۔"

☆============☆============☆

عوامی لیب نے بہت کم عرصے میں بہت اچھی ساکھ بنا لی تھی۔ اسپتالوں کے ڈاکٹر خون تجویز کرتے ہوئے سفارش کرتے تھے کہ مطلوبہ خون عوامی لیب سے لینے کی کوشش کی جائے لیب کا بزنس بھی بہت اچھا جا رہا تھا۔ بابر اب کراچی میں لیب قائم کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اس رات اس نے عاصم سے اس سلسلے میں بات کی۔

"پہلے یہاں کا کام پوری طرح جم جائے پھر آگے کی سوچنا۔" عاصم نے مشورہ دیا۔

"یہاں مجھے نہایت قابل اعتماد اسٹاف مل گیا ہے۔ کام بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ اب میں اپنا دھیان دوسری طرف دے سکتا ہوں۔" بابر نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ پہلے راولپنڈی اور پشاور کی طرف توجہ کی جائے۔ کراچی میں بعض بہت اچھی لیبارٹریز موجود ہیں۔"

بابر اس گریز کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ عاصم نہیں چاہتا تھا کہ وہ کراچی جائے۔ کراچی جائے گا تو بھابی اور بچوں سے بھی ملے گا۔ اس میں یہ خطرہ بہرحال تھا کہ وہ بھابی کا برا حال

دیکھے تو اپنا عہد بھول جائے اور اسے عاصم کے بارے میں بتا بیٹھے۔ بابر کی سمجھ میں یہ معما اب بھی نہیں آیا تھا۔ عاصم کا رویہ اسے غیر فطری لگتا تھا۔

"آپ کی فلم کی کیا پروگریس ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کاغذی تیاریاں مکمل ہیں۔ کاسٹ فائنل ہو جائے تو شروع کر دیں گے۔ میں اسکرپٹ سے بہت مطمئن ہوں۔" عاصم نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "میں فلم سے متعلق لوگوں کو میڈیکل چیک اپ کے لیے بھجواؤں گا۔ بل امداد پروڈکشنز سے چارج کرنا اور رپورٹ براہ راست مجھے بھجوانا۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان۔ ویسے یہ آپ نے بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔"

عاصم نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "بابر، مجھے ایڈز کے بارے میں بتاؤ۔"

"مجھے حیرت ہے کہ یہاں لوگ ایڈز کے بارے میں نہیں جانتے۔" بابر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایڈز کا وائرس انسان کے جسم کے مدافعتی نظام کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ معمولی سی کوئی بیماری حملہ آور ہو جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتی۔ مثلاً نزلہ زکام۔ مریض کو مستقل بخار رہتا ہے۔ دستوں کا سلسلہ نہیں رکتا۔ بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ وزن بہت تیزی سے گرنے لگتا ہے۔ اسی کیفیت میں مریض موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔"

"اور اس کے اسباب؟"

"اسباب کے بارے میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ریسرچ کا سلسلہ جاری ہے۔ ہاں یہ طے ہے کہ اس کا وائرس خون کے ذریعے خون میں شامل ہوتا ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ اب تک جو سب سے بڑا سبب سامنے آیا ہے وہ جنسی تعلق ہے۔ لیکن اور اسباب بھی یقیناً ہوں گے۔ اس پر کام کیا جا رہا ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ وائرس خون میں شامل ہونے کے بعد بیماری کا حملہ کتنے عرصے کے

بعد ہوتا ہے؟"

"اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ جوانوں میں وائرس زیادہ عرصے بعد فعال ہوتا ہے جبکہ بوڑھوں پر اس کا حملہ جلدی اور بعض اوقات بہت جلدی ہو جاتا ہے۔ میں اس بات کو یوں بیان کروں گا کہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ مریض کے جسم کا مدافعتی نظام کتنا طاقت ور ہے۔ اس کی عمومی صحت کیسی ہے۔ جو بچے پیدائشی ایڈز کے مریض ہوں وہ بہت زیادہ خطرے میں ہوتے ہیں۔ کسی شخص کے خون میں اگر بیس سال کی عمر میں ایڈز کا وائرس شامل ہو جائے اور اس شخص کی صحت بہت اچھی ہو اور وہ اپنا خیال رکھنے والا بھی ہو تو امکان ہے کہ بیماری کا حملہ اس پر بیس یا پچیس سال سے پہلے نہیں ہو گا۔ لیکن یہ بہرحال کوئی حتمی بات نہیں ہے۔ ایڈز کسی بھی وقت کسی بھی تجربے، کسی بھی کلیئے کو غلط ثابت کر سکتا ہے۔"

"مرض کا حملہ ہونے سے پہلے بھی مریض وائرس کسی دوسرے شخص کو منتقل کر سکتا ہے؟"

"جی ہاں، یہ خطرہ تو ایچ آئی وی کے ہر پازیٹو کیس میں موجود ہوتا ہے۔"

"اس کے سلسلے میں احتیاطی تدابیر۔"

"دیکھیے، یہ فرد سے زیادہ اسٹیٹ کا کام ہے۔ فرد کے لیے تو صرف ایک احتیاطی تدبیر کافی ہے کہ وہ زندگی اللہ کے احکامات کے مطابق گزارے۔ اس کے علاوہ کوئی احتیاط بچاؤ کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ فیملی پلاننگ کے نام پر جو گناہ کے لیے آسانی پیدا کر دی گئی ہے، وہ بہت بھیانک ہے۔ مغرب میں تو یہ تحقیق بھی کی جا رہی ہے کہ مانع حمل ادویات بھی کہیں ایڈز کا سبب تو نہیں بنتیں۔ یہاں میں حیران ہوں کہ کچھ بھی نہیں کیا گیا بلکہ شاید ابتدا میں تو ایڈز کا ذکر بھی حرام قرار دے دیا گیا۔ حیرت ہے کہ ٹی وی جیسے میڈیا پر فیملی پلاننگ کی تشہیر کرتے وقت یہ نہیں سوچا گیا کہ نابالغ لوگوں کو قبل از وقت آگہی دی جا رہی ہے اور لازمی طور پر اس کے مضر اثرات مرتب ہوں گے۔ لیکن ایڈز جیسے مہلک

مرض کا نام لینا بھی فحاشی کے زمرے میں آگیا۔ یہ تو شتر مرغ والا رویہ ہے۔ پھر یہاں ائرپورٹس پر باہر سے آنے والوں کے خون کی اسکریننگ کا ابھی تک بندوبست نہیں کیا گیا حالانکہ یہ بہت ضروری ہے۔ یہ کام تو ایڈز کی دریافت کے ساتھ ہی ہو جانا چاہیے تھا۔ دوسرے لیبارٹریز اور بلڈ بینکوں پر سختی کرنی چاہیے تھی۔ سرنج کے معاملے میں غیر ذمے داری اور خون کی اندھا دھند خرید و فروخت کو بڑا جرم قرار دینا چاہیے تھا۔ لیکن اس سلسلے میں اب تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ تو مجرمانہ غفلت اور بے پروائی ہے۔ یہاں تو میں دیکھ رہا ہوں کہ ایڈز کے لیے ہم نے اپنی تمام سرحدیں، تمام دروازے کھول دیئے ہیں اور لوگوں کو بتایا ہی نہیں گیا کہ ایڈز کیا ہے۔ باہر تو یہ تسلیم کیا جا رہا ہے کہ اسلام واقعی انسان کی فلاح کے لیے آیا ہے۔ اسلام نے ہر اس کام سے انسان کو روکا ہے بلکہ سختی سے روکا ہے، جو انسان کے لیے پرکشش ہونے کے باوجود ضرر رساں ہے۔ باہر تو اب اسلام کے حرام اور حلال کے تصور پر غور کیا جا رہا ہے۔ اسلام کی حرام قرار دی ہوئی چیزوں پر اس یقین کے ساتھ ریسرچ کی جا رہی ہے کہ وہ بے حد ضرور رساں ہوں گی۔ اور ہم مسلمان ہیں کہ حرام خوری میں لگے ہیں۔ حکمران کسی بھی معاملے میں اپنی ذمے داری نہیں نبھاتے۔"

"خوف خدا سے محروم ہیں۔" عاصم نے کہا "دو ایک کو ایڈز لاحق ہو جائے تو سب سدھر جائیں گے۔"

اس کا لہجہ اتنا خوف ناک تھا کہ بابر جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"بابر سنو، اب تک تمہاری لیب میں کتنے ایچ آئی وی کیس آئے ہیں؟" عاصم نے اچانک پوچھا۔

"گیارہ۔"

"تم نے ان کے سلسلے میں کیا کیا؟"

"نیشنل ایڈز پروگرام کو مطلع کر دیا۔"

"دیکھو۔ میری فلم کمپنی سے متعلق لوگوں میں اگر کوئی ایچ آئی وی کیس ہو تو اسے آگے نہ بڑھانا۔ بلکہ اپنے ریکارڈ میں بھی نہ رکھنا اور رپورٹ صرف مجھے بھیجنا۔"

"لیکن بھائی جان۔"

"یہ میرا حکم ہے بابر۔ انہیں میں خود ڈیل کر لوں گا۔" عاصم کے لہجے میں قطعیت تھی۔ بابر سرہلا کر رہ گیا۔

☆============☆============☆

عظمت مرزا حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ مرشد حسین کس قسم کا آدمی ہے۔ اسے کیا سمجھا جائے۔ لڑکیوں سے انٹرویو کے اگلے روز اس نے بینک کے کچھ فارموں پر اس سے دستخط کرائے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ قانونی دستاویزات بھی تھیں جن پر مرزا نے دستخط کیے۔ وہ دستاویزات پڑھنا چاہ رہا تھا مگر مرشد نے ہنستے ہوئے کہا تھا "میں آپ کو بتا دیتا ہوں مرزا صاحب۔ آپ کیوں وقت ضائع کرتے ہیں۔ اب یہ ایک ادارہ ہے۔ امداد فلمز لیمٹڈ، جس کے آپ سینئر پارٹنر ہیں۔ میں جونیئر پارٹنر ہوں۔ آپ ہی اس کے کرتا دھرتا ہوں گے۔ میں تو سیلانی آدمی ہوں۔ کبھی اچانک مہینوں کے لیے غائب ہو جاتا ہوں۔ بینک اکاؤنٹ اس طرح کا ہے کہ رقم نکلوانے کے لیے بیک وقت ہم دونوں کے دستخط ضروری نہیں ہم میں سے کوئی ایک بھی رقم نکلوا سکتا ہے۔"

"لیکن میاں صاحب۔"

"آپ معاوضے کے متعلق کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ تو مجھے ٹھیک طرح سے جانتے بھی نہیں۔ پھر مجھ پر اتنی بڑی ذمے داری کیوں ڈال رہے ہیں۔"

"مجھے بڑا مان ہے کہ میں آدمی کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ مخلص اور سچے فن کار ہیں۔ ایسا شخص جھوٹا، بے ایمان اور دھوکے باز نہیں ہوتا۔"

اس وقت تو مرزا کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس پر کتنی بھاری ذمے داری عائد کی گئی ہے۔ کتنا اعتبار کیا گیا ہے۔ مرشد حسین نے بینک کی پاس بکس اور چیک بکس اسے لا کر دیں تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ امداد فلمز لمیٹڈ کا اکاؤنٹ ۶۵ لاکھ روپے سے کھولا گیا تھا۔ ۶۵ لاکھ۔ اور وہ جب چاہے' جتنی بھی رقم نکلوا سکتا تھا۔

"نہیں میاں صاحب' میں خود کو اتنی بڑی ذمے داری کا اہل نہیں سمجھتا۔" عظمت مرزا تقریباً رو دیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں' میں تو سمجھتا ہوں۔ اور میں واضح طور پر کہہ رہا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں کبھی بھی مجھے جواب دہ نہیں ہوں گے۔"

اس بار مرزا پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ مرشد اسے تھپکتا رہا۔ اگلے روز مرزا نے "صبح بخیر شب بخیر" کا منظر نامہ مرشد کے سامنے رکھ دیا۔ مرشد نے اسے پڑھا اور چند ترامیم تجویز کیں۔ مرزا نے بخوشی انہیں قبول کر لیا۔ وہ مرشد حسین پر واقعی حیران تھا۔ اس کی فلمی سوجھ بوجھ حیران کن تھی۔

"بس آپ پہلے یہ فلم تیار کر لیں۔ اس کے بعد "ٹوٹے ستارے" پر دھیان دیجئے گا۔" مرشد نے کہا۔

"جی بہتر۔ آپ صوفیہ کو فائنل کر دیں۔ ہاں' شوٹ کہاں کریں گے؟"

"ایک بنگلا ہے میری تحویل میں۔ بہت خوب صورت اور مناسب ہے۔"

"اور اس فلم کے لیے اسٹاف؟"

"اسٹاف کی ضرورت نہیں۔ سب کام آپ کو ہی کرنے ہیں پروسیسنگ کے سوا۔ فوٹو گرافی اور ایڈیٹنگ آپ کر سکتے ہیں نا؟"

"جی ہاں' کیمرا تو میری پہلی محبت ہے اور ایڈیٹنگ کے بغیر کوئی ڈائریکٹر نہیں بن سکتا۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ ہر اعتبار سے یہ سولو جاب ہے۔ اب میں صوفیہ کو بلا رہا

ہوں۔"

☆===========☆===========☆

صوفیہ نے اسکرپٹ کی چند سطریں پڑھیں۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"یہ۔ یہ تو میرے اندازے سے مشکل ہے۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔"

"میں نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔" صوفیہ نے اب بھی نظریں نہیں اٹھائیں۔

"اور میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ سب کچھ سوچ لیں۔ خیر اب بھی کیا بگڑا ہے' واپسی کا راستہ تو کھلا ہے۔"

صوفیہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور مرشد کی آنکھوں میں دیکھتی رہی "آپ مجھے کیا آفر کر رہے ہیں۔"

"ٹوٹے ستارے میں ہیروئن کا رول۔"

"بس؟"

"اور کیا چاہتی ہیں آپ۔ ٹوٹے ستارے ایسی فلم ہے جو آپ کو ایک ہی جست میں شہرت کی بلندیوں پر لے جا سکتی ہے۔"

"لیکن اتنے لوگوں کے سامنے۔"

"وہاں مرزا صاحب کے علاوہ کوئی نہیں ہو گا۔" مرشد نے یقین دہانی کرائی "اور یہ فلم عام ریلیز کے لیے بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

مرشد نے وضاحت کی۔ صوفیہ کی آنکھیں چمکنے لگیں "مجھے منظور ہے۔"

مرشد نے معاہدے کے کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے "تو پھر اس پر دستخط کر دیجئے۔ میں منہ میٹھا کراتا ہوں۔" پھر اس نے نذیر کو آواز دی "مٹھائی لاؤ نذیر۔"

صوفیہ معاہدے کی تفصیلات پڑھ رہی تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اس کے

مطابق تو آپ مجھے پچاس ہزار روپے معاوضہ دے رہے ہیں۔"

"جی ہاں' دس ہزار ایڈوانس۔ بیس ہزار فلم آدھی مکمل ہونے کے بعد اور بیس ہزار فلم کی ریلیز سے پہلے۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے۔"

"وہ صبح بخیر شب بخیر کی بات تھی۔ اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہو گا۔ اس کا معاوضہ لے کر آپ حقیر ہو جائیں گی اور معاوضہ دے کر میں حقیر ہو جاؤں گا۔"

صوفیہ نے اسے شکر گزاری سے دیکھا اور کانٹریکٹ پر دستخط کر دیئے۔ میڈیکل چیک اپ کی شق پڑھ کر اسے حیرت ضرور ہوئی تھی۔

☆============☆============☆

"چوہدری صاحب' آپ کو فلم کیسی لگی؟" مرشد نے چوہدری جمیل سے پوچھا۔ اس نے فلم کا چھوٹا سا ٹریلر بنوا کر چوہدری کو دے دیا تھا۔

"ایسی حسین فلم میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" چوہدری نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"فلم تو ابھی آپ نے دیکھی ہی نہیں ہے۔ یہ تو بس جھلکیاں ہیں۔ ایک گھنٹے کی فلم ہے۔"

"تو مجھے دے دیں نا مرشد صاحب' نذرانہ منہ مانگا دوں گا۔" چوہدری نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"نذرانہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ صرف پانچ ہزار روپے۔"

چوہدری کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ دوسری طرف عظمت مرزا بھی حیران رہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ لاکھوں کی بات ہو گی۔ پھر چوہدری نے خود کو سنبھالا اور شک آمیز لہجے میں کہا "تو کیا اسے باقاعدہ ریلیز کریں گے آپ؟ یہ تو زیادتی ہو گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں چوہدری صاحب۔ خاص چیز تو خاص لوگوں کے لیے ہی ہوتی ہے۔" مرشد نے وضاحت کی "میں نے صرف پچاس پرنٹ بنوائے ہیں۔ صرف خاص

خاص لوگوں کو دوں گا اور وہ بھی اس شرط پر کہ کیسٹ عام نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی کمرشل کام نہیں ہے۔ صرف تعلقات کی وجہ سے میں نے یہ فلم بنائی ہے۔"

"تو کسی اور کو دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں جو موجود ہوں۔" چوہدری نے جلدی سے کہا۔

"لیکن چوہدری صاحب آپ پچاس پرنٹ لے کر کیا کریں گے؟ میں نے عرض کیا نا' یہ فلم عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔"

"لو' تو کیا میں یہ فلم چلواؤں گا۔ ویڈیو شاپس کو دوں گا۔" چوہدری نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا چوہدری صاحب۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ پچاس پرنٹ۔"

"لو جی' اپنے یاروں میں شوقین لوگ کوئی کم ہیں۔" چوہدری نے فخریہ لہجے میں کہا "پھر لوگوں سے کام بھی پڑتا رہتا ہے۔"

"لیکن آپ کسی کو دیں اور وہ اس کی کاپیاں بنا کر تجارت شروع کر دے۔"

"اس طرف سے آپ بے فکر ہو جائیں مرشد صاحب' ہم لالچی لوگ نہیں۔ نہ ایسے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جو ایسا دھندا کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔"

"دیکھ لیں چوہدری صاحب' آپ بڑی گارنٹی دے رہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں نا۔ بس آپ پرنٹ میری گاڑی میں رکھوا دیں۔" چوہدری نے جیب سے چیک بک نکالی اور ڈھائی لاکھ روپے کا چیک مرشد کی طرف بڑھایا۔

"یہ آپ مرزا صاحب کو دیں۔" مرشد نے مرزا کی طرف اشارہ کیا پھر مرزا سے بولا "مرزا صاحب' یہ چوہدری صاحب اپنے خاص آدمی ہیں۔ معاملات کے کھرے ہیں۔ جو کہہ دیں اسے پتھر پر لکیر سمجھیے۔ ان کا ہمیشہ خاص خیال رکھئے گا۔"

مرزا نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے چیک لیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ چوہدری

نے جاتے جاتے کہا "میاں صاحب' ایک بات بتا دوں آپ کو۔ یہ آپ کی ہیروئن بڑے لوگوں میں سپرہٹ ہو کر رہے گی۔"

چوہدری کے جانے کے بعد مرشد نے مرزا سے کہا "یہ ہے آپ کے ٹوٹے ستارے پر لگنے والے سرمائے کا کور۔ اب آپ ناکامی سے بے نیاز ہو کر فلم بنائیں۔"

"میں بہت کچھ سمجھ گیا ہوں لیکن کچھ باتیں اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"وہ آپ مجھ سے پوچھ لیں۔"

"ایک تو یہ کہ چوہدری صاحب نے پورے ۵۰ کیسٹ کیوں خرید لئے جبکہ کام ایک سے بھی چل سکتا تھا۔ ڈھائی لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی۔"

"جواب یہ ہے کہ چوہدری صاحب مجبور تھے۔ اگر ہم ۱۰۰ کیسٹ کہتے تو وہ ۱۰۰ کیسٹ خریدتے۔ چوہدری صاحب کے حلقہ احباب میں بڑے اور صاحب اختیار بیوروکریٹس ہیں' بینکار ہیں اور وزراء ہیں۔ یہ تعلق غرض کا ہے جس کے لیے دوستوں کو خوش کرنا ضروری ہے۔ اب یہی کیسٹ اگر کسی وی آئی پی کو چوہدری صاحب کے علاوہ کوئی ایکس وائی زیڈ بھی پیش کر دے تو اس کی کیا وقعت رہے گی۔ اس لیے تمام کیسٹ خریدنا چوہدری صاحب کے لیے ضروری تھا۔ اب یہ ایک قیمتی تحفہ ہے دوستوں کو خوش کرنے کے لیے۔ دوسری بات یہ کہ چوہدری صاحب کے لیے یہ ڈھائی لاکھ کوئی بڑی چیز نہیں۔ ایک طرح کی سرمایہ کاری ہے' جس سے وہ کروڑوں کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ چوہدری صاحب یہ فلم غیر ملکی شائقین کو فروخت کر دیں۔"

عظمت مرزا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ چوہدری صاحب اس فلم کی تجارت نہیں کریں گے؟"

"اس کی ایک وجہ تو میں نے تمہیں بتا دی۔ چوہدری صاحب کے لیے یہ فلم ایک نایاب تحفہ ہے' جسے صرف وہ کسی کو پیش کر سکتے ہیں۔ وہ فلم کا اچھوتا پن مجروح نہیں کر

سکتے۔ اس کے باوجود بھی میں نے احتیاطی تدبیر کی ہے۔" مرشد نے دراز کھول کر چھوٹا ٹیپ ریکارڈر مرزا کو دکھایا "ان کی گفتگو میں نے ٹیپ کر لی ہے۔"

عظمت مرزا بے ساختہ مسکرا دیا۔

☆============☆============☆

فلم ٹوٹے ستارے کا مہورت بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ فلم کی کاسٹ میں زیادہ تر نئے لوگ تھے۔ فلم کی شوٹنگ جس رفتار سے ہو رہی تھی اس سے لگتا تھا کہ تین چار مہینے میں فلم ایڈیٹنگ ٹیبل پر ہو گی۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اداکاروں کی ڈیٹس کا وہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

شام کو شوٹنگ جلدی پیک اپ کر دی گئی۔ عظمت مرزا کو اپنی فیملی کے ساتھ ایک تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ مرشد نے اس سے وعدہ لے لیا کہ تقریب سے نمٹنے کے بعد وہ اس کے گھر آ جائے گا "مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

دفتر میں مرشد نے صوفیہ سے' جس کا فلمی نام الماس رکھا گیا تھا' پوچھا "بے بی آج کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے تمہیں؟"

صوفیہ نے نظریں اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا "جی نہیں' کوئی کام ہے تو بتائیں۔"

"آج میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"

صوفیہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ مرشد اکیلا ہی رہتا ہے "نہ مجھے کوئی مصروفیت ہے اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔"

مرشد کو اس کی نظریں اچھی نہیں لگیں۔ تاہم اس نے مسکراتے ہوئے کہا "تو پھر چلو میرے ساتھ۔ تم سے ایک بہت اہم بات کرنی ہے۔"

صوفیہ کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ اس اہم بات سے بخوبی واقف ہے "چلئے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ باہر نکلے۔ صوفیہ مرشد کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی اسٹوڈیو سے نکل آئی۔

راستے میں مرشد نے صوفیہ سے پوچھا "کھانا پکانا آتا ہے تمہیں؟"

صوفیہ پھر حیران ہوئی "جی ہاں لیکن اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتی کہ میرا پکایا ہوا کھانا آپ کو پسند بھی آئے گا۔"

"تو پھر یہ زحمت کر سکو گی؟"

"کیوں نہیں۔"

"ویسے میں کھانے کے معاملے میں نخرے باز ہوں بھی نہیں۔"

راستے میں انہوں نے رک کر گوشت اور کچھ دوسری چیزیں لے لیں۔ صوفیہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

مرشد کا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر صوفیہ کو بہت اچھا لگا۔ مرشد نے بتایا کہ ایک ملازمہ روز صبح آتی ہے اور صفائی کر جاتی ہے۔ صوفیہ نے جا کر کچن کا جائزہ لیا۔ وہاں مسالے اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی "آپ خود بھی پکاتے رہتے ہیں کیا؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"کبھی کبھی موڈ بن جائے تو پکا لیتا ہوں۔"

"میرا ہاتھ بٹائیں گے؟"

"ضرور۔"

"اچھا یہ بتائیے کیا کھانا پسند کریں گے؟"

"کچھ بھی پکالو۔"

"بھوک جلدی لگنے کا امکان تو نہیں؟"

مرشد نے گھڑی دیکھی۔ سات بجے تھے "دو گھنٹے کی مہلت ہے تمہارے پاس۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ بریانی اور کباب بناؤں گی میں۔"

مرشد نے بڑی حد تک صوفیہ کا ہاتھ بٹایا۔ یوں کام جلدی نمٹ گیا۔ نو بجے وہ کھانے سے نمٹ چکے تھے۔ صوفیہ چائے بنا کر لے آئی۔ دونوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے

اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے "میں منتظر ہوں مرشد صاحب۔" اچانک صوفیہ نے کہا۔

"کس کی؟"

"اس خاص بات کی‘ جو آپ کو مجھ سے کرنی ہے۔"

"اس کے لیے تمہیں کچھ انتظار کرنا ہو گا۔"

صوفیہ نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھی اور اٹھ کر صوفے پر مرشد کے برابر آ بیٹھی "جھجکنے کی ضرورت نہیں مرشد صاحب۔" اس نے لرزیدہ آواز میں کہا "میں ذہنی طور پر تیار ہو کر آئی ہوں۔ ویسے بھی آپ کو میں نے ناپسند کبھی نہیں کیا۔"

مرشد نے سر گھما کر ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا "تم غلط سمجھ رہی ہو بے بی۔ میں ہرگز نہیں جھجک رہا ہوں۔ جھجکتا تو آدمی وہاں ہے جہاں کوئی خوف یا خدشہ ہو۔ لیکن تم میرے لیے بہت محترم ہو۔"

"حیرت ہے۔ میری وہ فلم دیکھنے کے باوجود۔"

"تم یقین نہیں کرو گی لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے وہ فلم نہیں دیکھی۔ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ تم سے ایک عجیب طرح کا دلی ناتا جڑ گیا ہے۔" مرشد نے گہری سانس لے کر کہا "ویسے بھی ان چیزوں میں‘ میں نے کبھی دلچسپی نہیں لی۔"

دیکھتے ہی دیکھتے صوفیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی "مجھے معاف کر دیجیے اس بدگمانی پر۔" وہ سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی "آپ مجھے ایسے ماحول میں ملے تھے پھر جس طرح آپ نے میرا انٹرویو لیا‘ مجھے وہ دوسرا اسکرپٹ دیا‘ میرا تاثر آپ کے بارے میں کچھ اور ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا۔ میں خود حیران ہوئی تھی کہ آپ کا امیج اچھا ہی کیوں بنتا ہے۔ آج جب آپ نے گھر چلنے کو کہا تو ایک شیشہ سا چٹخا۔ لیکن یقین کریں مجھے خوشی ہوئی۔ اب میں آپ سے وہ بات کہوں گی

جو مجھے کہنے کا حق نہیں۔ اس لیے کہ میں اس قابل ہی نہیں رہی۔ مگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

مرشد کے لیے وہ بے حد کمزور اور آزمائشی لمحے تھے۔ وہ بے حد حسین تھی' بے حد قریب تھی' اس سے اظہار محبت بھی کر رہی تھی اور وہ خود انسان تھا۔ خطا کا پتلا پھر وہ ایسا انسان تھا جو اپنی دانست میں ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا تھا۔ بہت قریب تھا کہ وہ بہک جاتا لیکن اس خیال نے کہ آخری لمحوں میں کیوں اپنا دامن آلودہ کرے' عین وقت پر اسے بچالیا۔

اس نے بے حد نرمی سے صوفیہ کو ہٹایا "تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔"

صوفیہ بے حد شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا اب ان کے درمیان گفتگو کے لیے کوئی موضوع نہیں رہا۔ مرشد نے اس کی کھسیاہٹ محسوس کر کے اس سے چائے کی فرمائش کر دی تاکہ شرمندگی اور تعطل کی فضا ختم ہو جائے "چائے زیادہ بنالینا' تھرماس میں بھرلینا۔ تھوڑی دیر میں مرزا صاحب بھی آنے والے ہیں۔"

"مرزا صاحب؟"

"ہاں' میں نے انہیں بھی بلایا ہے۔"

صوفیہ کچن میں چلی گئی اور مرشد ان رپورٹس کا جائزہ لینے لگا جو گزشتہ شب بابر نے اسے دی تھیں۔ ان رپورٹس کو دیکھتے ہوئے اس کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ اداسی کی دھند نے آہستہ آہستہ اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

صوفیہ چائے بنالائی تھی۔ دونوں چائے پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ صوفیہ کے انداز میں بے فکری تھی جیسے تھوڑی دیر پہلے ان کے درمیان کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مرشد بار بار اسے عجیب سی اداس سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ساڑھے دس بجے عظمت مرزا بھی آگیا۔ صوفیہ کو موجود پا کر وہ حیران ہوا۔ صوفیہ

کے پوچھنے پر اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ کھانا وہ تقریب سے کھا کر چلا تھا۔

"چائے پئیں گے؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"یا آپ کے ذوق کے مطابق کچھ پیش کروں۔" مرشد نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"شرمندہ نہ کریں میاں صاحب۔ جب سے مجھے میرا ماحول ملا ہے' میں نے آوارگی ترک کر دی ہے۔ میں اپنی موجودہ مقام پر بہت مطمئن اور خوش ہوں۔" مرزا نے جواب دیا۔ پھر وہ صوفیہ کی طرف مڑا "چائے پلاؤ بے بی۔"

"نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ آپ ایسے ہی ہیں۔" مرشد بولا۔

صوفیہ نے تھرموس سے چائے انڈیل کر مرزا کے سامنے رکھ دی۔ مرشد نے سگریٹ سلگائی اور ان دونوں کو غور سے دیکھا "اب میں آپ دونوں کی توجہ کا خواستگار ہوں۔" اس نے کہا "میں نے کہا تھا کہ مجھے بہت اہم بات کرنی ہے۔"

وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن بولے کچھ نہیں۔

"سب سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میں ایک کروڑ پتی صنعت کار ہوں۔ نہیں۔ تھا کہیئے۔ میری بیوی ہے' دو بچے ہیں۔ میں ان کو بہت چاہتا ہوں۔ بہت زیادہ لیکن میں خود سے بھاگ رہا ہوں۔ اس لیے کہ میں ایڈز کا مریض ہوں۔"

وہ بہت بڑا دھماکا تھا۔ صوفیہ اور مرزا کے چہروں پر زلزلے کا سا تاثر تھا۔ مرزا تو گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی منٹ سناٹا سا طاری رہا۔ پھر صوفیہ نے کوشش کر کے خود کو سناٹے کے اس طلسم سے نکالا "میں۔ میں یقین نہیں کر سکتی۔"

"میں بھی نہیں کر سکا تھا۔ لیکن میری خون کی رپورٹ بتاتی ہے کہ میرا ایچ آئی وی ٹیسٹ پازیٹو ہے۔"

"میں اب بھی یقین نہیں کر سکتی۔" صوفیہ تنویم زدگی کی سی کیفیت میں بڑبڑائی۔

"میرے بھائی کو چھوڑ کر صرف آپ دونوں دنیا میں ایسے ہیں جنہیں میں نے اس راز میں شریک کیا ہے۔ اس لیے کہ اب آپ ہی وہ لوگ ہیں جنہیں میں اپنی فیملی سمجھتا ہوں۔"

"آپ کی بیوی کو بھی نہیں معلوم؟" صوفیہ نے پوچھا۔ مرزا اب تک یوں بیٹھا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

مرشد یا عاصم نے انہیں اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں بتایا۔ وہ دونوں بڑی محویت سے سن رہے تھے "میں اپنے بچوں کو عمر بھر کی بدنامی کا داغ نہیں دینا چاہتا تھا۔" مرشد کہہ رہا تھا "سو میں ان کی زندگی سے نکل آیا۔ پہلے میں منفی انداز میں سوچتا رہا۔ میں قصور وار نہیں تھا۔ مجھے یہ مرض لگا تو یہ پورے معاشرے کا قصور تھا۔ پھر میں نے سوچا' ممکن ہے مجھ سے کوئی بہت بڑی خطا سرزد ہوئی ہو جو خداوند کریم کو بہت ناپسند ہوئی ہو۔ اس کی مجھے یہ سزا ملی ہو۔ پھر میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا۔ مگر ایک بات میں نے پھر بھی سوچی۔ میں جانتا ہوں کہ اس معاشرے میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے' جنہیں فرصت و مہلت گناہ نہیں۔ جن کی عمر دو وقت کی روٹی کی فکر میں تمام ہو جاتی ہے۔ پھر بھی وہ ایڈز سے محفوظ نہیں۔ انہیں احتیاط کی تلقین کی جاتی ہے اس لیے کہ معاشرے کی گمراہ اور دولت مند اقلیت صرف احتیاط پر انحصار کرتی ہے' جو کہ ناکافی ہے۔ وہ اقلیت معاشرے کی معصوم اکثریت کے لیے ایک مہلک خطرہ ہے۔ یہ وہ اقلیت ہے جس کی سوچ گناہ سے شروع ہو کر گناہ پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان گناہ گاروں کی فنا کے قدرتی عمل کو تیز کر دوں تاکہ معصوم اکثریت کا تحفظ یقینی ہو جائے۔ فلم سے میری دلچسپی کافی پرانی ہے۔ مگر میں یہ مشن لے کر اس طرف آیا۔ میں نے خود کو آلہ قہر سمجھ لیا۔ لیکن میں خود کو اس حیثیت میں استعمال نہیں کر سکا اور تن بہ تقدیر ہو گیا۔"

"مجھے بہت افسوس ہے مرشد صاحب۔" صوفیہ نے کہا "مگر اب میری الجھن دور ہو گئی ہے۔ آپ مجھے اس ماحول کے آدمی نہیں لگے تھے۔"

"میں بھی بہت کچھ سمجھ گیا ہوں۔" عظمت مرزا نے پہلی بار لب کشائی کی "میں بھی الجھ رہا تھا۔ آپ مجھے پیسے سے بے نیاز آدمی معلوم ہوتے تھے مگر آپ اچھی فلم پر لگنے والے سرمائے کے کور کی بات کرتے تھے۔ یہ بات آپ کے منہ سے غیر فطری لگتی تھی۔ پھر آپ نے یہ پورنو فلم بنوائی تو اس دوران بھی آپ کا رویہ عیاش رئیسوں کا سا نہیں تھا۔ پھر اس بات پر زور کہ یہ فلم عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ حالانکہ آپ اس سے خود لاکھوں کما سکتے تھے۔ آپ اسے بیرون ملک کے شوقین لوگوں کو منہ مانگے داموں بھی فروخت کر سکتے تھے لیکن اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ آپ ایک مشن کے تحت کام کر رہے تھے۔"

"کر رہا تھا نہیں کر رہا ہوں۔" مرشد نے کہا "میں یقین رکھتا ہوں کہ رزق حرام کا ایک لقمہ بھی خون میں شامل ہو جائے تو اس کے اثرات بے حد خوف ناک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آدمی گناہ کی دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ یہاں ایسے لوگ' ایسے سیاست داں' ایسے حکمراں ہیں جنہوں نے کرپشن کی انتہا کر دی ہے۔ جن کی رگوں میں خون نہیں' صرف رزق حرام دوڑ رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی گناہ سے بھی بچ سکتے ہیں۔ مجھے نفرت ہے ان لوگوں سے۔ میں انہیں ہٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میری سوچ یہ ہے کہ اگر غلط ہو تو اللہ معاف کرے کہ ان لوگوں کو گناہ کے ذریعے خدا کے قہر کی طرف لے جانا گناہ نہیں ایک قومی خدمت ہے۔ یہ لوگ بے حس ہو چکے ہیں۔ انہیں عوام کی کوئی پروا نہیں۔ یہ اس وقت سے بھی نہیں ڈرتے جب ملک کے عوام یہ دعا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اے اللہ' ان لوگوں کو ایڈز میں مبتلا کر دے۔"

عظمت مرزا جھرجھری لے کر رہ گیا۔ صوفیہ نے کہا "مجھے لگتا ہے' ابھی آپ نے ہمیں اہم بات نہیں بتائی ہے۔"

مرشد نے گہری سانس لی "ہاں۔ بات یہ ہے کہ آپ دونوں کے لیے ایک بری خبر ہے۔ آپ کی بلڈ رپورٹ بھی ایچ آئی وی پازیٹو ظاہر کر رہی ہے اور میری ہدایت پر اسے

ٹرپل چیک کیا گیا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہے۔"

"لیکن مجھے نہ دکھ ہے نہ حیرت۔" صوفیہ بولی "یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں تھی ہی اس قابل۔"

"میں نہیں مانتا۔ تمہیں کسی نے اس طرف دھکیلا ہو گا۔ تم ایسی نہیں ہو۔ بہرحال میں ڈاکٹر سے بات کر چکا ہوں۔ جوان لوگوں پر بیماری کا حملہ عام طور پر بیس پچیس سال بعد ہوتا ہے۔ یہ مہلت کافی ہے۔ اس دوران ہو سکتا ہے علاج بھی دریافت ہو جائے اس کا۔"

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے جینے کی کوئی آرزو نہیں۔ جتنی مہلت مل جائے بڑی نعمت ہے۔ میں بھی آپ کی طرح ایک مشن لے کر نکلی تھی۔ اس مشن کو آپ نے وسعت دے دی ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں' مجھے نہ کوئی دکھ ہے نہ ملال۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔" عظمت مرزا نے کہا "مسئلہ میرا بھی آپ والا ہے۔ بیوی بچے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری "میں ان سے بھاگ بھی نہیں سکتا۔ میرا تو سب کچھ یہ کیریر ہے اور اب تو یہ اور اہم ہو گیا ہے۔ زندگی نے مجھے جتنی بھی مہلت دی' میں اسے آپ کے مشن کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔" اچانک اس کی آنکھوں میں امید چمکی "میاں صاحب' کیا یہ ممکن ہے کہ میرا راز راز ہی رہے؟"

"اس طرف سے آپ بے فکر ہو جائیں مرزا صاحب۔ یہ بات کبھی کسی کو معلوم نہیں ہو گی۔"

"بس تو پھر میں خوش ہوں کہ مجھے اپنے گناہوں کی سزا دنیا میں بھی مل رہی ہے۔"

وہ تینوں دیر تک بیٹھے مستقبل کی باتیں کرتے رہے۔ اب وہ ایک فیملی تھی۔

اچانک مرشد نے صوفیہ سے کہا "میری ایک بات یاد رکھنا بے بی۔ خود کو سہل الحصول نہ بنانا۔ یوں تمہاری کشش بھی بڑھے گی اور تم زیادہ موثر بھی ثابت ہو گی۔"

صوفیہ نے بے دھیانی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے تصور میں اس وزیر کی

صورت تھی جو اس کے بھائی کے ساتھ مل کر اس کی تباہی کا سبب بنا تھا۔

مرزا ہذیانی انداز میں ہنسنے لگا "تو یہ ہے آپ کی امداد فلمز لمیٹڈ کی امداد عام لوگوں کے لیے اور ایڈز فلموں کے ذریعے گناہ گاروں تک محدود........"

☆============☆============☆

ڈکلیریشن کے اجرا پر سے سرکاری پابندی اٹھنے میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔ وحید نجمی کے لیے یہ عرصہ اکتا دینے والا تھا۔ اس نے اس عرصے میں ایڈز کے حوالے سے لیبارٹریز اور بلڈ بینکوں پر کافی گراؤنڈ ورک مکمل کر لیا تھا۔ کراچی کی حد تک وہ کام مکمل کر چکا تھا۔ اب اس کا ارادہ لاہور اور پھر راولپنڈی کی لیبارٹریز پر کام کرنے کا تھا۔

لاہور میں عوامی لیب کا بہت چرچا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس لیب نے بڑی اچھی ساکھ بنا لی تھی۔ نجمی نے اس کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر بابر نسیم سے ملاقات کا وقت لیا۔ ڈاکٹر کی شخصیت نے اسے بہت متاثر کیا۔ ڈاکٹر امریکا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ خون کے امراض کا وہ اسپیشلسٹ تھا۔

"آپ کی لیب کو قائم ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟" نجمی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"سات ماہ ہونے والے ہیں۔"

"آپ کو لیب قائم کرنے کا خیال کیوں آیا؟"

"دیکھیں' پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ میری فیلڈ ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ایڈز پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہو چکا ہے۔ اب بلڈ بینکوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی کو مطلوبہ خون دینے بلکہ لینے سے پہلے خون کی مکمل اسکریننگ کریں۔ ہر لیبارٹری میں ایڈز کے وائرس کی چیکنگ کا بندوبست ہونا چاہیے۔ یہ بڑا ذمے داری کا کام ہے۔ یہ صحت عامہ کا مسئلہ ہے۔ جو شخص بھی یہ کام کرے گا وہ درحقیقت ایک اہم قومی خدمت انجام دے گا۔"

"تو آپ کی لیبارٹری میں یہ کام ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر بابر چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا "میں اس کا جواب دوں گا۔ لیکن یہ آف دی ریکارڈ ہو گا۔" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا "آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ایڈز کے بارے میں یہاں لوگوں کا رویہ کیا ہے؟"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔" نجمی نے سرہلاتے ہوئے کہا "آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کی مرضی کے بغیر آپ کا کہا ہوا ایک لفظ بھی شائع نہیں ہو گا۔"

"شکریہ!" ڈاکٹر بابر مسکرایا "ہم نہ صرف اپنے معزز کرم فرماؤں کے خون کی ایچ آئی وی اسکریننگ کر رہے ہیں بلکہ مکمل ریکارڈ بھی رکھ رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس بات کا اعلان بھی کر دیں تو لوگ ہمارے پاس آنا چھوڑ دیں گے۔ یہاں تو ایڈز مرض کی بجائے ایک گالی کی صورت اختیار کر گیا ہے۔"

"درست کہا آپ نے۔ اور اس میں لوگوں کے رویے کا بڑا دخل ہے۔"

"لوگوں کو صحیح طرح سے بتایا بھی تو نہیں گیا ہے ایڈز کے بارے میں۔ اور اچھوت بننے سے تو ہر شخص ڈرتا ہے۔"

"جی ہاں یہی بات ہے۔ کئی ایسے افراد ہیں جنہیں اپنے ایڈز میں مبتلا ہونے کا علم ہوا تو وہ روپوش ہو گئے۔" نجمی نے کہا "ایک شخص تو ایسا تھا کہ جو ڈاکٹر سے یہ کہتا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ لہٰذا اب وہ اس مرض کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرے گا۔"

"کمال ہے۔ اس شخص کو تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی؟ یہ تو بے حد خطرناک بات ہے۔"

"اخبار میں خبر چھپی لیکن اس شخص کو بہرحال سنجیدگی سے تلاش نہیں کیا گیا۔ ایڈز کی بدنامی کا یہ حال ہے کہ دولت مند لوگ جو ہمارے معاشرے میں بے حد طاقت ور ہوتے ہیں، وہ بھی خود کو معاشرے میں ایڈز کے مریض کی حیثیت سے نہیں پیش کر

پاتے۔ وہ روپوش ہونے والا شخص تو بہت غریب آدمی تھا۔ خون بھی بیچتا تھا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے۔ کوئی دس ماہ پہلے ملک کے ایک معروف کروڑ پتی صنعت کار نے بھی روپوشی اختیار کر لی۔ اس کا آج تک سراغ نہیں ملا۔"

ڈاکٹر بابر کچھ چونکا "کروڑ پتی صنعت کار؟ کیا نام تھا اس کا؟"

"یہ بات پلیز اپنی ہی حد تک رکھیے گا۔" نجمی نے کہا "اس صنعت کار کا نام عاصم قریشی تھا۔" ڈاکٹر بابر کی آنکھوں میں اسے حیرت نظر آئی "آپ جانتے ہیں انہیں؟"

"نہیں، میں نے بتایا نا کہ میں آٹھ سال امریکا رہ کر واپس آیا ہوں۔" ڈاکٹر بابر نے پرسکون لہجے میں کہا۔ حالانکہ اندر ہی اندر وہ اپنے پورے وجود کو لرزتا محسوس کر رہا تھا "البتہ نام مجھے سنا ہوا لگا ہے۔"

"میں نے قریشی صاحب کے بارے میں بہت چھان بین کی۔ لیکن وہ ہر اعتبار سے بہت صاف ستھرے آدمی ثابت ہوئے۔ انہوں نے خود بھی ڈاکٹر سے کہا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں ایڈز کیسے لگا ہو گا۔"

"دیکھیں، ان ڈائریکٹ طریقے بھی تو ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایڈز کا ہر مریض گناہ گار ہو۔"

"آپ کے خیال میں ایڈز کی روک تھام کے لیے حکومت نے موثر اقدامات کیے ہیں؟"

"موثر اقدامات؟" ڈاکٹر تلخی سے ہنسا "مجھے تو ابھی تک اقدامات بھی نظر نہیں آئے ہیں۔ حکومت تو بس ایک ادارہ قائم کر کے مطمئن ہو گئی ہے۔ انداز شترمرغ والا ہے جو ریت میں منہ چھپا کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا پہاڑ جیسا وجود بھی چھپ گیا ہے۔ اب اس ادارے کے نام کو ہی لیجیے۔ نیشنل ایڈز پروگرام۔ پہلی بار میں نے یہ نام سنا تو سمجھا کہ یہ غریبوں کی مدد کرنے والا کوئی فلاحی ادارہ ہے۔ پھر بتایا گیا کہ یہ ایڈز کا چکر ہے۔ اب بھی نام سے مجھے یہ ادارہ ایڈز کی روک تھام والا نہیں بلکہ فروغ والا لگتا ہے۔ نیشنل

ایڈز پروگرام۔" اس نے تمسخر سے دہرایا "یہ ہے ہمارا حال۔ نیشنل ایڈز کنٹرول ہی رکھ دیتے نام۔ اور اس ادارے کی ناقص کارکردگی کی گواہی ٹی وی اور اخبارات دیتے ہیں۔"

"اچھا۔ آپ کا بلڈ بینک؟"

"مجھے فخر ہے کہ ہم یہ بڑا کام کر رہے ہیں۔ ہم دعوے سے صاف ستھرا خون فراہم کرتے ہیں ضرورت مندوں کو۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات ہم ضرورت پوری نہیں کرپاتے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ کوئی خون فروخت کرنے آئے تو ہم پوری طرح ٹیسٹ کیے بغیر خون قبول نہیں کرتے۔ لہٰذا ہمارے وسائل کم ہیں۔ عطیہ دینے والے کم ہی آتے ہیں۔ بہرکیف ہم کسی کو ضرر رساں خون نہیں دیتے۔"

"اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔" نجمی نے کہا "ایڈز کے سلسلے میں عام لوگوں کے لیے کوئی پیغام ہے آپ کا؟"

ڈاکٹر بابر چند لمحے سوچتا رہا "جی ہاں' میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایڈز کے کسی بھی مریض کو بدکار اور گناہ گار نہ سمجھیں۔ اسے ملامت' نفرت اور گریز کی نہیں' ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اس کا نظروں کے سامنے رہنا اچھا ہے۔ دوسری صورت میں وہ انسانی بم بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ہم میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ محض شک کی بنا پر کسی کو مجرم قرار دے دیں۔ حقیقت صرف خدا کو معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں تو پیار سے بس ہمدردی کرنی چاہیے۔"

"ایڈز کی روک تھام کے لیے حکومت کو کوئی مشورہ دیں گے آپ؟"

"ائرپورٹس پر خون ٹیسٹ کرنے کا انتظام ضروری ہے۔ غیر ملکیوں کو بغیر چیکنگ کے ملک میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ دوسری بات' باہر سے آنے والے پاکستانیوں کو بھی ائرپورٹ پر ہی چیک کیا جائے خواہ ان میں دو چار ہفتوں کے کاروباری' تفریحی دوروں پر جانے والے ہوں خصوصاً جو عام طور پر مشرق بعید کے ممالک یا ہندوستان کا رخ کرتے ہیں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ بھارت اور مشرق بعید کے ممالک میں ایڈز کے مریض

کتنی بڑی تعداد میں ہیں۔ پاکستان میں یہ مرض باہر سے ہی آیا ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی "یہ کام ابتدا میں ہی ہو جانا چاہیے تھا۔ اب تک تو صورت حال نہ جانے کتنی خراب ہو چکی ہو گی۔ پھر بھی کم از کم اب تو یہ کام کر لیا جائے۔ دوسرے ایڈز کے مریضوں پر نظر رکھی جائے۔"

"شکریہ ڈاکٹر" نجمی اٹھ کھڑا ہوا۔

☆==========☆==========☆

بابر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔

گمشدہ کڑی مل گئی تھی۔ زنجیر مکمل ہو گئی تھی۔ بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ عاصم کا رویہ جو ناقابل فہم لگتا تھا' اب ناقابل فہم نہیں رہا تھا۔ معما حل ہو گیا تھا لیکن کیا ایسا تھا؟ اس معمے کا تو کوئی حل نہیں تھا۔ ایڈز موت تھی۔ یقینی موت!

بابر یہ سوچ کر کانپ اٹھتا تھا کہ عاصم اتنے عرصے سے اکیلا اپنی سولی اپنے کاندھے پر اٹھائے پھر رہا ہے۔ ایک معزز' قابل فخر شخص اپنی شناخت سے' اپنی محبوب بیوی سے' اپنے چہیتے بچوں سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو گیا تھا اور وہ کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کرب کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

بابر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا جی چاہا کہ اس وقت جا کر بھائی جان سے لپٹ جائے۔ روئے اور انہیں بھی رلائے کہ اب تک نہ جانے کتنے آنسو وہ پی چکے ہوں گے۔ انہیں دلاسا دے۔ انہیں بتائے کہ ان سے محبت کرنے والا کوئی بھی شخص ان کی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ وہ اب بھی سب کو محبوب ہیں۔ اور آخری لمحے تک وہ انشاء اللہ اکیلے نہیں ہوں گے۔

آخری لمحے کا خیال آتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ دیر تک روتا رہا۔ پھر اچانک اس کا دل جیسے جگمگا اٹھا۔ گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن بھی بہت ہوتی ہے۔ اس نے اس کرن کو جیسے دل کی مٹھی میں بند کر لیا۔

یہ خیال اسے بعد میں آیا کہ یہ فیصلہ کچھ دشوار تو نہیں ہے بلکہ ہونا ہی یہ چاہیے تھا۔

☆============☆============☆

صوفیہ دل ہی دل میں خوش تھی لیکن بظاہر پریشان اور برہم نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی "میں کہہ چکی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔" اس نے چوہدری جمیل سے کہا۔ چوہدری جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں امداد فلمز لمیٹڈ کے دفتر کے اندرونی کمرے میں بیٹھے تھے۔

"کیوں ناممکن ہے؟" چوہری نے کہا۔

"اس لیے ناممکن ہے کہ نہ مجھے رقص آتا ہے نہ ہی میں گانے والی ہوں۔"

"تو تم ایک معزز مہمان کی حیثیت سے شریک ہو سکتی ہو؟"

"دیکھیں چوہدری صاحب، میں نادان بچی نہیں، سب سمجھتی ہوں۔ میں اس طرح کی نجی محفلوں میں شریک نہیں ہو سکتی۔" صوفیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیوں آخر؟ یہ تو تمہاری عزت افزائی ہے۔ اس محفل میں تین منسٹر شریک ہوں گے۔"

"یہ منسٹر آخر مجھ پر ہی کیوں مہربان ہو رہے ہیں۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔"

چوہدری مکاری سے ہنسنے لگا "تبھی فلم نگری میں چلی آئی ہو۔"

"فلم نگری میں ابھی تک قدم بھی نہیں رکھا میں نے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے مرشد صاحب اور مرزا صاحب جیسے لوگ ملے۔ میں ایک عزت دار لڑکی ہوں۔ اسی لیے میں نے کسی اور ادارے کی کوئی فلم قبول نہیں کی۔ اب تک کسی نے یہاں میلی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا مجھے۔"

"تم بھول رہی ہو۔ ادارہ تمہاری ایک دھانسو فلم خاص لوگوں میں ریلیز کر چکا

ہے۔" چوہدری نے زہریلے لہجے میں کہا "اس فلم سے تم عزت دار لڑکی تو ثابت نہیں ہوتیں۔ اس فلم نے بڑے لوگوں کو دیوانہ بنا دیا ہے تو اس میں کس کا قصور ہے؟ تمہارا ہے عزت دار لڑکی۔"

صوفیہ نے چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "وہ فلم بھی مجھے عزت دار ہی ثابت کرتی ہے۔ ورنہ میں اکیلی نہ ہوتی اس فلم میں۔"

"اسی بات نے تو ویلیو بڑھا دی ہے تمہاری۔" چوہدری نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "دیکھو بے بی الماس، بے کار ضد نہ کرو۔ تم خوش قسمت ہو کہ ابتدا ہی میں اتنا اونچا جانے کا موقع مل رہا ہے۔ میں تمہیں جن لوگوں سے متعارف کر رہا ہوں، وہ بڑے اختیار والے لوگ ہیں۔ ان سے کیا کچھ نہیں مل سکتا تمہیں۔ ضد کرو گی تو نقصان میں رہو گی۔ جو لوگ تمہیں عزت سے بلوا رہے ہیں وہ تمہیں اٹھوا بھی سکتے ہیں۔"

"خیر۔ ملک میں اب اتنی لاقانونیت بھی نہیں۔" صوفیہ نے کمزور لہجے میں کہا۔

"میں لاقانونیت کی نہیں، قانون کی بات کر رہا ہوں۔ وہ فلم جو تمہیں اتنا اوپر لے جا رہی ہے، تمہیں تباہ بھی کر سکتی ہے۔ تمہارے خلاف ناقابل تردید ثبوت بھی بن سکتی ہے۔"

صوفیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ خوف زدہ نظر آنے لگی "اچھا میں سوچوں گی چوہدری صاحب۔"

"سوچنا کیا ہے۔ پروگرام مری میں ہو گا۔ تمہیں مسلسل شوٹنگ نے تھکا دیا ہے۔ میں میاں صاحب سے بات کر لوں گا۔ تمہیں پندرہ دن کی چھٹی مل جائے گی۔"

"پندرہ دن؟"

"میرا وہاں شاندار بنگلہ ہے۔ وہیں قیام کرنا۔ میں تو دو دن سے زیادہ نہیں رک سکوں گا۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ آپ میاں صاحب سے بات کر لیں۔" صوفیہ نے مردہ لہجے میں

کہا۔ دل ہی دل میں وہ ہنس رہی تھی کہ موذی اپنی موت کو خود آواز دے رہے ہیں۔

☆===========☆===========☆

فلم آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ الماس اگرچہ موجود نہیں تھی مگر دوسرے اداکاروں کی شوٹنگ جاری تھی۔ مرشد جمعرات کی رات معمول کے مطابق اسٹوڈیو سے جلدی نکل آیا۔ وہ گھر پہنچا تو بابر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔

بابر اپنے ساتھ کھانا لے کر آیا تھا۔ دونوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا پھر بابر نے چائے بنائی۔ چائے پینے کے بعد عاصم کو جماہیاں آنے لگیں۔

"لگتا ہے آپ بہت تھک گئے ہیں۔" بابر نے کہا۔

"تھکن تو نہیں ہے لیکن نیند بہت آ رہی ہے۔"

"تو سو جائیں۔"

"نہیں، اب ایسا بھی نہیں۔ ٹی وی پر آج بہت اچھی فلم آ رہی ہے۔"

لیکن عاصم فلم نہ دیکھ سکا۔ نیند پر قابو پانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ بستر پر جا لیٹا اور چند لمحوں میں ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ بابر نے ایک گھنٹے انتظار کیا۔ پھر اس نے اپنے بیگ سے سرنج نکالی اور بڑی مہارت سے عاصم کی کلائی سے خون لیا۔ عاصم کسمسایا بھی نہیں۔ بابر اس وقت بے حد ایکسائٹڈ تھا۔ اپنے لیب اسسٹنٹ کو وہ پہلے ہی رکنے کی ہدایت کر آیا تھا۔

اس نے عاصم کو کمبل اڑھایا اور دروازہ لاک کر کے باہر نکل آیا۔ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت اس کا رواں رواں دعا کر رہا تھا۔

☆===========☆===========☆

عاصم کی آنکھ کھلی تو کمرے میں ہلکی دھوپ اتر چکی تھی۔ اس کی نظر سرہانے کرسی ڈال کر بیٹھے ہوئے بابر پر پڑی تو اسے حیرت ہوئی۔ بابر محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے جاگتے دیکھا تو مسکرایا۔

"کیا بات ہے، تم سوئے نہیں؟" عاصم نے پوچھا۔

"نہیں بھائی جان۔ کل جاگنے کی رات تھی۔" بابر نے مسکراتے ہوئے کہا "اور اب بھی نہیں سوؤں گا۔ یہ جشن منانے کا دن ہے۔"

عاصم اٹھ بیٹھا "کیا بات ہے۔ معموں میں بات کر رہے ہو۔ رات تو ایسی کوئی بات نہیں کی تم نے۔"

"خوش خبری) آپ کے سونے کے بعد ملی تھی۔"

اچانک عاصم کو کہنی سے نیچے اس جگہ تکلیف کا احساس ہوا، جہاں سے بابر نے خون لیا تھا "ارے یہ کیا، رات کسی کیڑے نے کاٹ لیا شاید۔" وہ بڑبڑایا۔

"اس کیڑے کا نام بابر نسیم ہے بھائی جان۔"

"کیا۔ کیا مطلب؟"

"رات میرا جی چاہا کہ آپ کا خون چکھ کر دیکھوں۔" بابر نے کہا۔ عاصم کا چہرہ فق ہو گیا "ڈریے نہیں، مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ آپ ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"یہ صبح صبح کیا بکواس۔"

"بھائی جان، جس نے آپ کا خون چیک کر کے ایچ آئی وی پازیٹو ڈکلیئر کیا تھا، وہ غلطی پر تھا۔"

عاصم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"اس کا بھی زیادہ قصور نہیں۔ میں نے اس وائرس کو اسٹڈی نہ کیا ہوتا امریکا میں تو میں بھی دھوکا کھا جاتا۔" بابر نے اپنی بات جاری رکھی "رات میں نے ٹیسٹ کرنے کے لیے آپ کا خون لیا تھا۔ جا کر اسکریننگ کرائی اپنے سامنے۔ پونے چھ بجے خوش خبری لے کر واپس آیا اور آپ کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔"

"میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آ رہی ہے۔"

"آپ باتھ روم میں ہو آئیں۔ میں اتنے میں ناشتے کا بندوبست کرتا ہوں۔ پھر بیٹھ

کر سکون سے بات کریں گے۔"

عاصم باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں اسے غور کرنے کا موقع مل گیا۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی۔ اس کے بعد تو اس کے لیے سکون سے نہانا بھی ممکن نہیں رہا۔ جلدی جلدی کپڑے بدل کر وہ باہر نکل آیا۔ بابر ناشتا لے آیا تھا۔ لیکن عاصم نے صرف چائے پر اکتفا کیا۔

"تم مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو کہ مجھے ایڈز کا کوئی خطرہ لاحق نہیں؟" اس نے بابر سے پوچھا۔

"سمجھا نہیں رہا ہوں' حتمی طور پر بتا رہا ہوں۔" بابر نے کہا "پوری طرح چھان بین کے بعد یہ بات کہہ رہا ہوں۔"

عاصم کچھ سوچنے لگا پھر بولا "پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ بات معلوم کیسے ہوئی؟"

بابر نے اسے نجمی کے متعلق تفصیل سے بتا دیا۔

"اور تم نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا تاکہ میں گھر جاؤں اور بیوی بچوں کے ساتھ ایک نارمل زندگی گزارنے لگوں اور آخر کار ایڈز سے مر جاؤں۔"

"میں جانتا تھا کہ آپ اسی انداز میں سوچیں گے۔" بابر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "حالانکہ میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور اتنا بڑا جھوٹ بولنے کا' دھوکا دینے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں بھائی جان۔ بہرحال آپ کی اس بے یقینی کا بھی حل ہے میرے پاس۔ میں آپ کو امریکا لے کر چلوں گا۔ وہاں سے آپ مطمئن ہو کر وطن واپس آئیں گے۔ پھر ہم کہیں اور نہیں جائیں گے۔ بس گھر چلیں گے۔ ٹھیک ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے بابر۔" عاصم کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

"بھائی جان' آپ جانتے ہیں کہ آپ مجھے کتنے عزیز ہیں۔" بابر نے جذباتی لہجے میں کہا "میں آپ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میری بات سچ ہے۔"

عاصم نے بابر کو لپٹا لیا "مجھے یقین آ گیا میرے بھائی لیکن امریکا ہم پھر بھی چلیں گے۔"

"بالکل چلیں گے لیکن اب آپ عاصم قریشی کی حیثیت سے جائیں گے۔ اپنا پاسپورٹ دے دیں مجھے۔"

عاصم کا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر فوزیہ اور بچوں کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن احتیاط کے نام پر چند دن اور سہی۔ کاش۔ کاش وہ فوزیہ کو فون ہی کر سکتا۔

☆==========☆==========☆

وہ ان لوگوں کی الوداعی ملاقات تھی۔ عاصم اگلے روز بابر کے ساتھ امریکا جا رہا تھا۔ صوفیہ اور عظمت مرزا کی حالت عجیب تھی۔ وہ سانس روکے بیٹھے عاصم سے تفصیل سن رہے تھے۔ کبھی ان میں سے کسی کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا اللہ کا شکر ہے۔

"مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ میاں صاحب۔" عظمت مرزا نے کہا "اگرچہ دکھ بھی ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو جائیں گے لیکن آپ ہماری دنیا کے آدمی ہی نہیں تھے۔" مرزا کے لہجے میں اداسی اتر آئی "آپ کو تو اللہ نے ہم لوگوں کو نئی زندگی دینے کے لیے بھیجا تھا' گمنامی میں مر جانا جن کا مقدر تھا۔"

صوفیہ بیک وقت اپنے آنسوؤں کو پینے اور چھپانے کی کوشش کر رہی تھی "مبارک ہو مرشد صاحب' مجھے یقین تھا کہ آپ کے معاملے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔"

عاصم اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ اسے وہ رات یاد آ گئی' جب وہ صوفیہ کو اپنے ساتھ گھر لایا تھا۔ جب اس نے اپنا راز ان پر منکشف کیا تھا۔ وہ وقت شاید اس کی آخری آزمائش کا تھا۔ تنہائی' صوفیہ کا حسن اور اس کی سپردگی۔ اور پھر یہ ترغیب کہ پارسائی کے صلے میں بدکاری کی سزا تو مل ہی چکی ہے۔ عاصم کو یاد تھا کہ شیطان نے ان لمحوں میں اس کے کانوں میں فسوں پھونکا تھا۔ لیکن اللہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ اس آزمائش سے

سرخرو نکلا تھا۔ اگر اس رات اس سے لغزش ہو گئی ہوتی تو اب وہ یقینی طور پر ایچ آئی وی پازیٹو کیس ہوتا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گیا "صوفیہ بے بی اگر مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔"

صوفیہ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے "ایسی باتیں نہ کریں پلیز۔ آپ نے تو ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ اب آپ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں تو میرے پاس آپ کی صرف اچھی یادیں ہیں۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"اب آپ عاصم قریشی کی حیثیت سے اصل زندگی گزاریں گے۔" مرزا نے کہا "یہ خوشی کی بات ہے۔ ہمیں بھی کبھی کبھی یاد کرتے رہیے گا کوئی خبر پڑھ لیں تو دعائے مغفرت کر دیجیے گا۔" اس بار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "میں نے اپنے بدترین دنوں میں تنہائی کے باوجود بھی کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن اب میں بھری دنیا میں' اپنے گرد لوگوں کا جمگھٹا ہونے کے باوجود تنہائی محسوس کروں گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں رابطہ رکھوں گا آپ سے۔"

"میرا مشورہ مانیں تو ایسا نہ کیجیے گا۔" مرزا نے کہا "مرشد صاحب کو یہیں چھوڑ جائیں آپ۔ اور عاصم قریشی کا ہم سے کوئی تعلق رکھنا مناسب نہیں ہو گا۔"

عاصم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر عاصم نے کہا "میں آپ لوگوں کو بتا نہیں سکتا کہ کتنا شکر گزار ہوں آپ کا۔ جب میں دنیا میں اکیلا تھا' اپنی شناخت تک سے محروم تو آپ میری فیملی بنے۔"

ماحول بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ صوفیہ نے گفتگو کا رخ بدلا "امریکا سے واپسی پر کیا کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے کوئی کاروبار۔"

"کاروبار میں تو عمر گزر گئی۔" عاصم نے اداسی سے کہا "اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اخبار نکالوں گا' کاروبار کے لیے نہیں' صحافت کی آبرو کے لیے' سچ لکھنے کے لیے عام لوگوں کی رہنمائی کے لیے۔"

"ہم آپ کی کامیابی کے لیے دعا کرتے رہے گے۔"

"آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"ہم اپنا کام کرتے رہیں گے۔" عظمت مرزا نے کہا "مشن جاری رہے گا۔ نتائج خدا کے اختیار میں ہیں۔"

صوفیہ تائید میں سرہلا رہی تھی۔

"امداد فلم لینڈ کو یا آپ لوگوں کو کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو عاصم قریشی کو فون کر دیجیے گا۔"

☆============☆============☆

فوزیہ اب قدرے پرسکون تھی۔ ڈکلیریشن مل گیا تھا۔ ہفت روزہ آنگن کی اشاعت شروع ہو گئی تھی۔ پہلے شمارے کی سیل اگرچہ کم تھی لیکن اب پرچہ بتدریج جگہ بنا رہا تھا۔ پہلا شمارہ کسی بھی اسٹال سے ہٹنے نہیں دیا گیا تھا اور اب فوزیہ متوقع نتائج کی بے صبری سے منتظر تھی۔ گھر میں جب بھی فون کی گھنٹی بجتی' وہ اس توقع پر ریسیور اٹھاتی کہ عاصم کی آواز سنائی دے گی لیکن ابھی تک مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ بس اب انتظار کی وہ کیفیت تھی اور وہ۔ دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ پرچے کی مصروفیات نہ ہوتیں تو شاید یہ انتظار اسے پاگل ہی کر دیتا۔

اس شام وہ تھکی ہاری گھر پہنچی۔ بیٹھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھایا "ہیلو؟"

"بھابی السلام علیکم!" دوسری طرف سے چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ارے بابر!" وہ خوش ہو گئی "بے مروت لڑکے' کتنے عرصے بعد فون کیا ہے تم نے۔" ساتھ ہی اس کا دل دھڑکا کہ اب وہ بھائی جان کو پوچھے گا۔

"بھابی' آپ کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔"

"واپس آ رہے ہو نا؟"

"جی ہاں لیکن خوش خبری اور ہے۔ اپنے ساتھ آپ کے لیے ایسا تحفہ لا رہا ہوں کہ آپ خوش ہو جائیں گی۔"

"بتاؤ نا۔"

"آپ کی ہی ایک گمشدہ چیز ہے۔"

فوزیہ کا دل بے طرح دھڑکا۔ اس کی تو ایک ہی چیز گم ہوئی تھی۔ عزیز ترین ہستی۔ اس کا شوہر۔ "پہیلیاں نہ بجھواؤ بابر۔"

بابر کا لہجہ ہیجانی ہو گیا "آپ بھائی جان کی یادگار سالگرہ کی تیاری مکمل کر لیں۔ میرے ساتھ بھائی جان بھی ہوں گے۔ اب آپ بالکل پریشان نہ ہو۔ بھائی جان بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہم لوگ انشاء اللہ سالگرہ والے دن پہنچیں گے۔"

فوزیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دل تھا کہ قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ بابر بھابی' بھابی پکار رہا تھا لیکن بولنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا "بابر۔ بابر کیا یہ سچ ہے؟" اس نے سسکیوں کے درمیان پوچھا۔

"بھابی اتنے بڑے معاملے میں' میں مذاق کروں گا کیا؟ پلیز بھابی آپ روئیں نہیں۔"

"میں کتنی خوش ہوں' بتا نہیں سکتی۔ اس سے بڑی خوش خبری کوئی مجھے سنا نہیں سکتا۔"

"بس تو منہ مانگا انعام پکا۔"

"بالکل پکا۔"

"تو انعام میں وہیں آ کر لوں گا۔ اچھا بھابی خدا حافظ۔"

فوزیہ ریسیور رکھ کر سناٹے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ بابر نے کہا تھا بھائی جان بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ جس حال میں بھی ہوں میرے لیے تو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں لیکن ابھی اس کے آنے میں آٹھ دن ہیں۔ کیسے کٹیں گے یہ

دن۔ وہ روتے روتے ہنس دی۔ ایک سال سے زیادہ کی جدائی سہنے والی اب صرف ایک ہفتے کی جدائی سے گھبرا رہی تھی۔

اچانک اسے بچوں کا خیال آیا۔ بچوں کو بھی بلوا لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔

"باجی' میں ثمینہ بول رہی ہوں۔"

"اوہ ثمینہ۔"

"باجی کل اسکول کا آخری دن ہے پھر چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ انہیں لے آؤں یا۔"

"ارے پگلی' ابھی میں اسی لیے تمہیں فون کرنے والی تھی کہ تمہارا فون آ گیا۔ بچوں کو لے آؤ۔"

"کیا بات ہے باجی' بہت خوش لگ رہی ہیں؟"

"خوش خبری تم بھی سنو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ ۳۰ دسمبر کو تمہارے بھائی جان گھر آ رہے ہیں۔"

"مبارک ہو باجی۔" ثمینہ کی آواز سے خوشی چھلک رہی تھی۔

"بس تم کل کی فلائٹ سے آ جاؤ بچوں کو لے کر۔ بہت سی تیاریاں کرنی ہیں۔"

"ٹھیک ہے باجی۔"

☆============☆============☆

عاصم کی کیفیت ایسی تھی جیسے وہ عالم خواب میں ہو۔ ذہن پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ بابر کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایڈز کا مریض نہیں تھا۔ امریکی ڈاکٹروں نے کچھ دوائیں تجویز کر دی تھیں۔

دس دن وہ اسپتال میں داخل رہا تھا اور اب وہ وطن واپس جا رہا تھا۔

سفر کے دوران وہ صرف یہ سوچتا رہا کہ فوزیہ کا سامنا کیسے کرے گا۔ اس ذہنی کیفیت میں یہ فیصلہ کرنا اس کے لیے دشوار تھا کہ اس نے گھر چھوڑ کر غلطی کی تھی یا نہیں۔ فوزیہ کو اعتماد میں نہ لینا زیادتی تھی یا نہیں۔ اب اس کا رویہ کیسا ہونا چاہیے اور فوزیہ کا رویہ کیسا ہو گا۔ ان سوچوں نے اسے اور الجھا دیا۔

اسے علم نہیں تھا کہ بابر گھر فون کر کے آمد کی اطلاع دے چکا ہے۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ ائرپورٹ سے ہی منہ چھپا کر کہیں نکل لے گا۔ لیکن ائرپورٹ پر فوزیہ اور بچے ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ فوزیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے جبکہ بچوں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

پھر بپھرے ہوئے دریا نے بند کو توڑ دیا۔ عاصم کو کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ اسے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ کب وہ گاڑی میں بیٹھے اور کب گھر پہنچے۔ گھر جسے وہ بھول چکا تھا‘ جس سے وہ دست بردار ہو چکا تھا‘ جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہاں اب وہ قدم بھی نہیں رکھ سکے گا۔ وہ ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ثمینہ بھی اس سے لپٹ گئی۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ بچے البتہ حیران تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ وہ ان کے ہاسٹل میں قیام کے دوران گھر میں نہیں تھا۔

عاصم اپنے بیڈ روم میں چلا آیا۔ فوزیہ اور بچے اس کے ساتھ تھے۔ ثمینہ بابر کو اس کا کمرا دکھانے لے گئی جو پہلے ہی اس مقصد کے لیے تیار کیا جا چکا تھا۔

”فوزیہ میں........“

فوزیہ نے اس کی بات کاٹ دی ”کیا پھر بھاگ جانے کا ارادہ ہے؟“ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

”نہیں تو‘ کیا مطلب“ وہ بڑبڑا گیا۔

”مطلب یہ کہ باتوں کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی آپ باتھ روم جائیں‘ نہا دھو کر تازہ دم ہوں اور فوراً سو جائیں۔ دو گھنٹے بعد آپ کو جگا دیا جائے گا۔“

عاصم نے گھڑی میں وقت دیکھا‘ صبح کے نو بجے تھے ”لیکن میں........“

فوزیہ نے پھر اس کی بات کاٹ دی ”بس آپ کو اس ہدایت پر عمل کرنا ہے۔ آپ باتھ روم میں جائیں۔ میں بچوں کو لے کر جا رہی ہوں۔ آپ کے کپڑے نکال جاؤں گی۔“

”مگر کپڑے تو میرے سوٹ کیس میں ہیں۔“

فوزیہ نے ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا ”آپ کو یاد نہیں کہ آپ اس وقت اپنے گھر میں ہیں اور گھر میں آپ کا وارڈ روب موجود ہے۔“

عاصم کھسیا کر باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر نکلا تو کپڑے بیڈ پر پھیلے نظر آئے۔ اس نے کپڑے بدلے تو عجیب طمانیت کا احساس ہوا۔ پہلی بار اسے یقین آیا کہ وہ گھر واپس آ گیا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ اس کا وجود شکر گزاری کے احساس سے چھلکنے لگا۔ رب کریم نے اس کا سب کچھ اسے لوٹا دیا تھا۔ وہ شکر کے دو نفل پڑھنے کھڑا ہو گیا۔

وہ دو رکعتیں بہت طویل تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ یونہی نماز پڑھتا رہے۔ آنکھوں سے شکر کے آنسو بہتے رہیں اور سجدے کی لذت۔ سر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

اس وقت وہ فوزیہ سے کہنا چاہتا تھا کہ اسے نیند نہیں آ رہی ہے اور نیند اسے اب بھی نہیں آ رہی تھی۔ بس وہ فوزیہ کی بات رکھنے کے لیے بستر پر جا لیٹا۔ بستر جیسے جانی پہچانی کسی آغوش کی طرح اس کے لیے وا ہو گیا۔ اسے بے خبر سونے میں چند لمحے بھی نہیں لگے اور وہ ایسی نیند تھی جو گھر سے باہر اسے ایک بار بھی میسر نہیں آئی تھی۔ آٹھ گھنٹے سو کر بھی نہیں۔ پھر وہ خواب دیکھ رہا تھا وجود میں طمانیت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر اس کی دونوں رخساروں پر چپکے ہوئے ہونٹ محبت کا امرت اس کی روح میں اتار رہے تھے۔ پھر کورس میں آواز ابھری ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ اس مقام سے آوازیں جدا ہو گئیں۔ بچے ڈیڈی کہہ رہے تھے‘ فوزیہ عاصم کہہ رہی تھی اور ایک بھائی جان کا ڈوئٹ بھی تھا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خواب نہیں تھا۔ وہ سب اس کے کمرے میں موجود تھے۔ سلیم اور ملیحہ اس کے رخسار چوم رہے تھے۔ فوزیہ سرہانے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ثمینہ کھڑی تالیاں بجا رہی تھی اور سامنے بابر کیمرا لیے یہ سب کچھ ریکارڈ کر رہا تھا۔

عاصم بوکھلا گیا ”یہ۔ یہ کیا؟“

”ڈیڈی، آپ کو یاد نہیں، آج آپ کا برتھ ڈے ہے۔“ ملیحہ کے لہجے میں شکایت تھی۔

”کیا واقعی؟“ اس نے تائید کے لیے پہلے فوزیہ اور پھر بابر کو دیکھا۔

”بیٹے تمہاری ڈیڈی بھلکڑ پروفیسر ہو گئے ہیں۔“ فوزیہ نے ملیحہ سے کہا ”اچھا اب اٹھ جائیے، کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔“

عاصم نے گھڑی میں وقت دیکھا، بارہ بج چکے تھے۔ وہ اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ دھو کر کمرے سے نکلا تو سب ڈائننگ روم میں موجود تھے۔ وہاں ایک اجنبی چہرہ بھی تھا

”بھائی جان، آپ کو ایک اہم شخص سے ملواؤں۔“ بابر نے کہا ”آپ آج کے دن کے ہیرو ہیں تو یہ اس کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور مصنف ہیں۔“

”پھر تو یہ وی آئی پی ہوئے۔“ عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا ”لیکن میں سمجھا نہیں۔“

”یہ وہ پریس رپورٹر ہیں وحید نجمی، جنہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ نہ بتاتے تو شاید ہم یہاں اکٹھے نہ ہوتے۔“

”آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں ڈاکٹر۔“ نجمی کا چہرہ تمتمانے لگا۔

”نہیں نجمی صاحب، بابر نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں بلکہ ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔“ اس نے گرم جوشی سے نجمی سے ہاتھ ملایا ”کس اخبار کے لیے لکھتے ہیں آپ؟“

نجمی مسکرانے لگا ”آج کل تو بیگم صاحبہ کے لیے کام کر رہا ہوں۔“

عاصم کو حیرت ہوئی لیکن اس دوران ثمینہ اس کی طرف آنگن کی پہلی کاپی بڑھا

چکی تھی۔ ”چھوڑو جی، جس کے لیے ہم نے یہ سب کیا اسے تو پتا بھی نہیں۔“ فوزیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا اب کھانے کو انتظار نہ کرائیں آپ لوگ۔“ ثمینہ نے احتجاج کیا۔

کھانے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ عاصم نے فوزیہ سے کہا ”تم خواہ مخواہ آگے نکل گئیں۔ جانتی ہو، میں یہ ارادہ کر کے آیا ہوں کہ اب اخبار نکالوں گا۔“

”تو اب آپ کے لیے ایک سیٹ اپ پہلے سے موجود ہے۔“

نجمی نے کہا ”ویسے آپ جیسے آدمی کو اس فیلڈ میں ضرور آنا چاہیے۔“

”آپ مجھے جانتے بھی نہیں پھر ایسی بات اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہیں؟“

”آپ کے قریبی لوگوں کو چھوڑ کر دنیا میں سب سے زیادہ آپ کو میں جانتا ہوں۔“

”یہ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔“ فوزیہ نے ہنستے ہوئے کہا ”تحقیق ان کا خاص میدان ہے۔“

”تب تو یہ ہماری ٹیم میں شامل ہوں گے انشاء اللہ۔“ عاصم نے کہا ”ارے فوزیہ اپنے اسٹاف سے تو ملواؤ نا۔“

”شام کو مل لیجیے گا۔ میں نے آپ کی برتھ ڈے پر سب کو مدعو کیا ہے۔“

☆============☆============☆

اس بات کو تین ماہ ہو چکے تھے۔ پاکستان میں اس عرصے میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سوائے اس کے کہ وفاقی کابینہ سے کچھ وزیر رخصت ہو گئے تھے اور کچھ نئے لوگ کابینہ میں شامل کر لیے گئے تھے۔ اس سے قطع نظر وہی فضا تھی، وہی کمر توڑ مہنگائی تھی اور وہی وعظ کہ عوام دو تین سال اس طرح قربانی دیتے رہے تو پاکستان کو دائمی خوش حالی نصیب ہو جائے گی۔ لیکن ارباب اقتدار کے اللے تللے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی ان کے طور

طریقے اور انداز دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ ملک میں جمہوریت نہیں ملوکیت قائم ہے۔

عاصم قریشی کو روزنامہ "صبح بخیر" کا ڈکلیریشن مل چکا تھا۔ اخبار کے اجرا کے لیے تین ماہ کی مہلت دی گئی تھی مگر عاصم کو امید تھی کہ وہ ایک ماہ کے اندر ہی اخبار کو اسٹال پر لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تمام انتظامات پہلے ہی سے مکمل تھے۔ عاصم کا ارادہ تھا کہ جس دن کوئی دھماکا خیز خبر آگئی اسی دن سے اخبار کی اشاعت شروع ہو جائے گی۔

فوزیہ کا ہفت روزہ آنگن خاصا مقبول ہو رہا تھا۔ اس کی اشاعت مسلسل بڑھ رہی تھی۔ ادارے کے لوگ روزنامے کی اضافی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے بے تاب تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے کیونکہ ان کے پبلشرز دیانت دار بھی تھے اور حوصلہ مند بھی۔

ہاں' ملک میں ایک اور مثبت کام بھی ہوا تھا۔ عوامی لیب اینڈ بلڈ بینک نے کراچی میں بھی کام شروع کر دیا تھا۔ بابر کا خیال تھا کہ آئندہ سال پشاور یا راولپنڈی میں بھی لیب کی شاخ قائم ہو جائے گی۔

اس صبح عاصم تازہ اخبار کا فلمی صفحہ پڑھ رہا تھا۔ فلمی صفحہ وہ باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اس روز عظمت مرزا کی فلم ٹوٹے ستارے کے متعلق خبر چھپی تھی کہ فلم آئندہ جمعے سے عام نمائش کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔ خبر دینے والے نے لکھا تھا فلم کی اسٹوڈیو رپورٹ اور سنسر رپورٹ بے حد شان دار ہے۔ پریمیر شو دیکھنے والے ناقدین کا کہنا ہے کہ ٹوٹے ستارے فلم انڈسٹری کے مردہ تن میں نئی روح پھونک دے گی۔ ممکن ہے یہ ایسی آرٹ فلم ثابت ہو جو باکس آفس پر کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کرے۔ فلمی نجومیوں نے اس فلم کی زبردست کامیابی کی پیش گوئی کی ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ فلم ہیروئن الماس اپنی معصومیت' حسن اور اعلیٰ کردار نگاری کے زور پر اس فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی سپر اسٹار بن جائے گی۔ واضح رہے کہ الماس فلم کی ریلیز سے پہلے ہی خواص میں سپر اسٹار کا مرتبہ پا چکی ہے۔ غیر فلمی سرگرمیوں کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت اونچا اڑ رہی

ہے بلکہ اوپر ہی اوپر جا رہی ہے۔

عاصم نے اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھا اور بابر کی طرف متوجہ ہوا جو فوزیہ سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا "کیا سازش ہو رہی ہے؟"

"آپ بھی سن لیں۔" بابر نے کہا "بھابی نے مجھ سے منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا تھا' اب مکر رہی ہیں۔"

"دیکھو نا' تم نے مانگا بھی کیا ہے۔" فوزیہ بولی۔

"کیا مانگ لیا بھئی؟" عاصم نے متجسس لہجے میں بابر سے پوچھا۔

"میں کہہ رہا ہوں ثمینہ سے میری شادی کرا دیجیے۔"

فوزیہ مسکرا دی تھی۔ عاصم نے پوچھا "پھر تمہاری بھابی کیا کہتی ہیں؟"

"کہتی ہیں' وہ تو بہت پہلے سے بک ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہیں۔" عاصم نے کہا۔ پھر وہ فوزیہ کی طرف مڑا "ثمینہ سے بکنگ کنفرم بھی کرا لی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"بس تو پھر بتا دیں۔"

بابر کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بابر' منہ مانگا انعام تمہارا ہوا۔" فوزیہ نے کہا۔

بابر کا منہ پہلے حیرت سے کھلا پھر وہ اچانک ہنسنے لگا "میں سمجھ گیا۔ میں نے منہ مانگے انعام کا موقع گنوا دیا۔ یہ تو آپ لوگ پہلے سے طے کیے بیٹھے تھے۔ اب مجھے یاد آیا' لاہور میں ایک دن بھائی جان نے مجھ سے کہا تھا "میں اور تمہاری بھابی تمہارے لیے ایک بہت پیاری لڑکی تلاش کر چکے ہیں۔ یہ الگ بات کہ تم پہلے ہی کسی کو پسند نہ کر چکے ہو۔" بابر نے عاصم کی سی آواز بنا کر دہرایا "پھر بڑی سوگواری سے یہ بھی فرمایا تھا' کاش۔ میں تمہاری شادی میں شریک ہو سکوں۔"

عاصم جھینپ گیا۔ فوزیہ قہقہے لگانے لگی۔ اسی وقت ثمینہ کافی لے آئی "کس بات پر ہنس رہی ہیں؟" اس نے فوزیہ سے پوچھا۔

"مت پوچھو۔ ادھر بھائی جان کو دیکھو اور عبرت پکڑو۔ بات تمہیں بتا دی تو تمہارا حشر ان سے بھی برا ہو گا۔ دیکھ رہی ہو ان کا جھینپنا۔" بابر نے کہا۔

ثمینہ بغیر بات سنے اور سمجھے ہی جھینپ گئی۔ اس بار عاصم بھی قہقہوں میں شامل ہو گیا۔

======== ختم شد ========